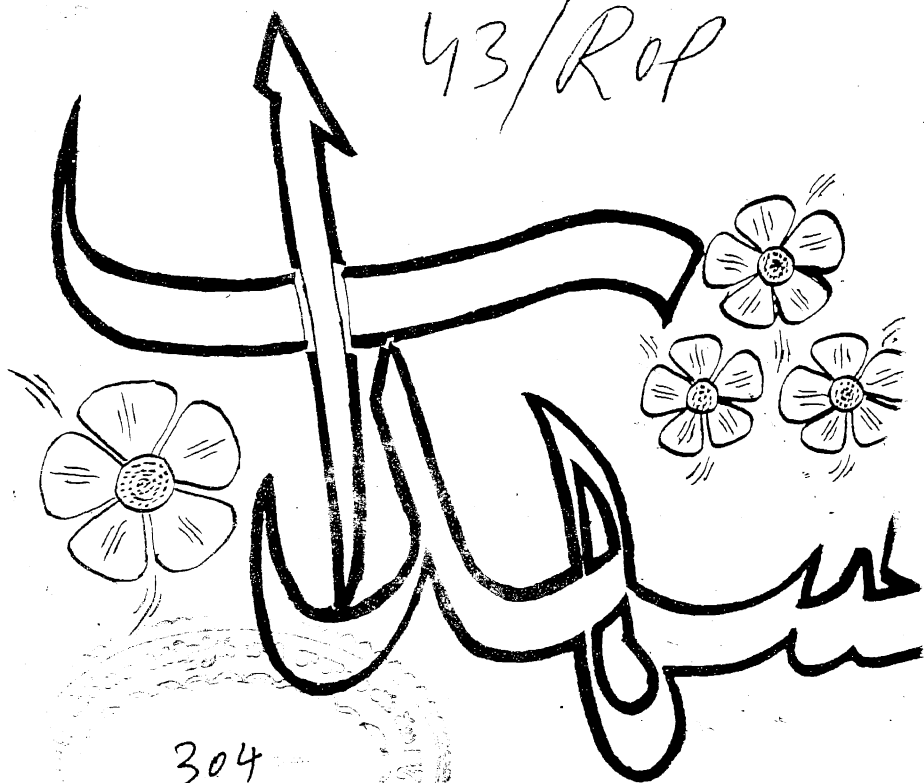


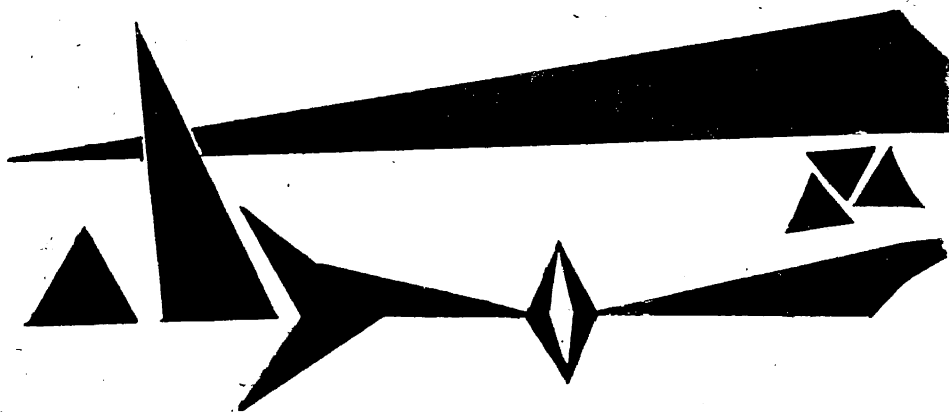
43/R04



304
3-93

Acc. No.
331

رؤف خیر



جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

بار : اول
سن اشاعت : جولائی ۱۹۹۳ء
A.C.C. No. 331
تعداد : ایک ہزار
کتابت : یوسف رضا
طباعت : اسپید پرنٹس، آفیسٹ پرنٹرس اینڈ بائینڈرس
۱۶-۲-۸۳۶/۷-رحمت کدہ "نزد فرح کالونی، سید آباد حیدر آباد
500659

قیمت : چالیس روپے

ناشر : خیری پبلی کیشنز، "بیت الخیر" (۱۹/۲۰۲-۱۰-۹)، دلاور شاہ نگر
رسالہ بازار، گوگلکٹڈ، حیدر آباد - ۵۰۰۰۰۸
مرتبین : ایلاف خیری، عقیف خیری، عطوف خیری، لطیف خیری
لاف خیری، ہاتف خیری، تالیف خیری
کتاب ملنے کے پتے :

- ۱- شب خون کتاب گھر - ۳۱۳ - رانی منڈی، الہ آباد - ۲
- ۲- مکتبہ جامعہ میٹریڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵
- ۳- مکتبہ قہر لاہور، پوسٹ بکس ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰۰۸
- ۴- حدیث پبلی کیشنز، ۱۵۹-۱- پی آئی آئی سی کالونی،
حیدر آباد ۵۰۰۰۷۲

یہ کتاب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کے جبروی مالی تعاون سے شائع ہوئی

43/ROP

ACC. No.
331

انتساب

نوب صورت و نوب سیرت بیٹ

عقیفہ خیری

304
3-93

کے نام

۴
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرضِ ناشر

رُوفِ خَیو پانچ نومبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی۔ اب اُردو کے لکچرر ہیں۔ ان کی ایک نظم ”جب میں اسکول جانے لگتا ہوں“ حکومت ہمارا شہر نے چوتھی جماعت کے نصاب میں شامل کر رکھی ہے۔ ایک اور نظم ”ہمالہ“ کو حکومت آندھرا پردیش نے دوسری جماعت کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ آپ کا کلام آل انڈیا ریڈیو دہلی، عالمی سروس، ممبئی، کلکتہ، بھوپال اور حیدرآباد سے نشر ہوتا رہتا ہے۔ ٹی وی پر بھی آپ نے انھیں دکھایا ہوگا۔ کل ہند اور ہندوپاک مشاعروں کے یہاں رُوفِ خیر نے ہندوستان کے کئی اہم شہر دیکھ ڈالے۔

ان کے پچھلے دونوں مجموعے ”اقراء“ اور ”ایلاف“ تقریباً نایاب ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان مجموعوں سے چند تخلیقات منتخب کر کے ہم نے ”شہد اب“ میں شامل کر لیں تاکہ آپ کے ذوق کی بہتر پذیرائی ہو سکے۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری مرحوم نے ”اقراء“ پر ”خدا لگتی“ کے عنوان سے ”بلٹن“ میں جو تبصرہ کیا تھا، وہ ان کی کتاب ”کتاب شتاسی“ میں بھی شامل ہے۔ یہ تبصرہ ایک ایسے ناقد نے کیا تھا جو رُوفِ خیر کو بالکل نہیں جانتا تھا اور جس نے رُوفِ خیر کو ان کے شعر کے حوالے سے پہچانا تھا۔ ہم نے ”شہد اب“ میں اس تبصرہ کو شامل کر لیا ہے۔

محترم شمس الرحمن فاروقی کی رائے بھی رُوفِ خیر کے لئے ایک سند کا درجہ رکھتی ہے کہ، حق گوئی و بے باکی میں ان کا تانی کونی نہیں۔ اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں اُردو اکیڈمی کا جزی تعاون بھی گھر کی تعمیر میں زمین کی فراہمی کے مترادف ہے۔ ناسپاس گزاری ہوگی اگر ہم اپنے کرم فرما مصلح الدین سعدی کا شکریہ ادا نہ کریں جن کا خلوص ہمیشہ ہمارے شاملِ حال رہا۔

اب ”شہد اب“ پڑھیے اور اپنی رائے سے نوازئیے کہ آپ کی رائے ہمارا حوصلہ بڑھائے گی۔

شمس الرحمن فاروقی

روؤف خیر کا مداح میں ایک زمانے سے ہوں۔ پھر جب جدیدیت کا بازار گرم ہوا تو وہ شعراء جن کا رنگِ کلام اور طرزِ فکر گویا از خود اس نئے لعجہ و آہنگ کا نمونہ ٹھہرا، اُن میں روؤف خیر بھی تھے۔ لیکن بہت سے دوسرے نئے شعراء کی طرح انہوں نے جدیدیت کی گرمی بازار سے فائدہ اٹھا کر دھڑا دھڑا مجموعہ کلام کی بارش نہیں کر دی بلکہ سوچ سوچ کر کہتے رہے، اپنے کلام کو اپنی ہی تنقیدی نظر سے پرکھتے رہے، فن کے پُرانے اسالیب کو بھی صحیح تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس بنا پر ان کا پہلا مجموعہ ”اقراء“ (۱۹۸۲ء) نظرِ غائب، دیرین سامنے آیا لیکن کلام کی صلابت اور لعجے کے اعتماد کی بنا پر اسے بہت جلد جدید شعراء کے عمدہ نمونوں میں شمار کر لیا گیا۔ یہی عالم روؤف خیر کے دوسرے مجموعہ ”ایلاف“ (۱۹۸۲ء) کا تھا۔ اس وقت تک روؤف خیر کی حیثیت نئے شعراء کی محفل میں پوری طرح مستحکم ہو چکی تھی۔ اب جو روؤف خیر کا تیسرا مجموعہ ”شہلا آب“ آپ کے ہاتھوں میں ہے تو غیبی ایک تازہ مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نویں اور دسویں دہائی کے شعراء کچھ بھی کہیں، لیکن ساتویں دہائی کے شعراء نے زندگی کو برتننے اور اسے شعر میں باواسطہ طور پر سمونے کا جو ڈھنگ دریافت کیا تھا، وہ آج بھی سکھ رائج الوقت ہے، اور آج کے کسی شاعر کو روؤف خیر جیسے شاعر سے معاملہ کتنے بغیر چارہ نہیں۔

روؤف خیر نے زندگی کو ایک ایسے شخص کی طرح دیکھا ہے جو اپنا نیک کسی محفل میں بٹھادیا گیا ہو، لیکن اس محفل کے آداب اور اس کی زبان سے وہ نا بلند ہو۔ کوشش کے باوجود نو وار و کو ایسی محفل تھوڑی بہت معاند، تھوڑی بہت نامفہوم اور تھوڑی بہت ناقابلِ برداشت لگے گی۔ معاندت اور نامفہومی کے تجربے کو روؤف خیر نے کہیں بھائی بھائی کی معاندت

کہیں گزشتہ شعری اسالیب سے انکار کہیں سرکس کے جانوروں کی قید با مشقت کے استعاروں سے ظاہر کیا ہے۔

رؤف خیر نے استعارہ اور علامت پر نظم کی بنیاد رکھنے کی بجائے پوری نظم کو استعارہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

غزلوں میں رؤف خیر اپنے ہجے کی بنا پر پہچانے جاتے ہیں۔ اس ہجے میں شدت اور کسی بات کو بڑے یقین یا زور سے کہنے کی کوشش کے بجائے ایک ایسی خاموش، بظاہر سکون لیکن باطن گونجتی ہوئی روح کی لاتعلقی کی زبان استعمال ہوتی ہے جو خود ترجمی، گریہ و بکا اور آہ و فغاں کے بجائے ٹھنڈی، تقریباً لاشخصی اور حکیمانہ ہے۔ لیکن اس میں مریاتہ رنگ نہیں کیوں کہ ان غزلوں کا متکلم خود کو آپ ہی کی سطح پر رکھ کر گفتگو کرتا ہے۔

”شہد اب“ نہایت عمدہ مجموعہ ہے میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

سمیع الرحمن دہلی

(دہلی - ۱۲ جون ۱۹۹۳ء)

ظ - انصاری

حیدر آباد کے رؤف خیر کا شعری مجموعہ کھولا تو ایسا معلوم ہوا کہ گیلی لکڑیوں کی ٹال پر جو ایندھن تلوایا تھا اس میں صندل کی ٹہنی بھی چلی آئی ہے۔ تھکتی ہوئی۔
شاعر نے پشت کے سرورقی پر اپنا فوٹو چھاپ دیا۔ حالات نہ لکھے۔ اگرچہ شعر کو تولتے وقت شاعر کی زندگی سے جانکاری لازم نہیں، تاہم اس سے کچھ روشنی مل جاتی ہے۔ بعض اوقات کسی نظم یا شعر کی اہمیت خود شاعر کے اعمال نامے سے وابستہ ہوتی ہے۔

یہ تیلارا ۱۲۰ صفحے کا مجموعہ قرآن کے سورۃ علق (اقرا یا سم ربی) سے اور اس کے بعد لغت سے شروع ہوتا ہے اور تمام ہوتا ہے ”ترائیلے“ (صنف سخن) پر جسے اردو میں دارد ہوتے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں گزرے۔ آخری ترائیلے اپنے اکلوتے بھائی کے نام ہے۔

عنوان ”دیوار“۔ ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا

ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح

اتنا بڑا تو نہ تھا خون کا رشتہ اپنا

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا

اپنی اپنی بے خوشی در در ہے اپنا اپنا

ہم ہوئے شاخ سے ٹوٹے ہوئے کی طرح

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو چھوٹا اپنا

ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح

مگر یہاں مشاہدوں کے تحفے اس طرح بکھرے پڑے ہیں کہ ہمیں شاعر کا احوال جانتے سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ غزلیں، نظمیں، آزاد، پابند نظمیں، سانیٹ، تراویلی، یہاں سب رنگ ہیں اور سب میں الگ الگ قسم کی تازگی۔ زندگی سے شاعر کے برتاؤ کی جھلکیاں۔ وہ نہیں جیسے استادانِ سخن اپنا دیوان مرتب کرتے وقت اگر دیکھتے کہ حروفِ تہجی میں کوئی ایک آدھ حرف ردیفِ قافیہ میں بندھنے سے رہ گیا تو اس حرف کے نام کی بھی غزل لکھ لکھ کر دیوان میں ڈال دیا کرتے تھے کہ گڈھانہ رہ جائے۔

رُوفِ تیر نے جہاں تک نظر گئی حسن اور درد کے نام سے آپنچ لی ہے۔ پڑوسی کے چولہے سے نہیں مانگی۔ کچی مشق کے باوجود وہ سچے شاعر ہیں۔ پہلی ہی غزل کا مطلع ہے:

ابھی نگاہ کو بغیرانہ ہونا ہے

کہ فلسفوں کو ابھی عامیانہ ہونا ہے

یہاں عامیانہ کا لفظ غالباً عام فہم کے معنی میں آیا ہے اور ابھی کی تکرار بھی کچھ خوشگوار نہیں۔ ان دونوں کو تا ہیوں کے باوجود اس تصور کی ریتج ایسی زبردست، فلسفہ اور پیغمبری کے رشتے پر ایسی خیال انگیز اور دو ٹوک کمزری ہے کہ شعر بیک وقت دل و دماغ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ اور کیا سادہ مقطع ہے:

رُوفِ خیر چلو یہ بھی اب غنیمت ہے

بھلائی کہتے ہیں جس کو بُرا نہ ہونا ہے

اساتذہ کی نظر میں پہلے مصرعہ کو یہاں ”ہے“ پر ختم نہ ہونا چاہیے۔ یہ تب بھی عیب تھا

اور اب بھی عیب ہے۔ مگر شعر کیا ہے؟ — بے ناسچا؟

پوری غزل دی جائے تو شاعری کی ادنیٰ تیج کھلے:

تجھ کو پالینے سے بہتر ہے ترا کھوجانا۔ آج اتنا سرا مالوسِ وفا ہو جانا
جب کوئی زخم ہتھیلی پہ لگا تو جانا ہائے کیا چیز ہے پابندِ جنا ہو جانا
آج تک بھی وہی دیوانہ ادا باقی ہے گھر سے نکلے تو تری راہ گزر کو جانا
خشک لمحوں کے ہی مارے ہو ہلوگ ہیں لات بھیکے تو ضروری تو نہیں سو جانا
تو پیمانہ ہو، ہم نے بھی یہ سوچا ہے داغ ناکرہ گناہی کے ہیں کیا دھو جانا
کون پھر پھر میں کیا جانے کہاں رہ جاؤ فرصت ہے ابھی خاکِ اُٹرو جانا

آج سوئی ہیں بہت دیر و محرم کی راہیں اس طرف ہو کے ذرا بادہ گسا رو جانا
 خیر آنکھوں کے تہی کا سہ لئے پھرتا ہے اور کس چیز کو کہتے ہیں لہو رو جانا
 ہم عصر عزیزوں کو غالب پسندوں سے چڑھ گئی ہے کہ وہ غالب کے پھیر میں پڑے ہیں اور
 اپنے زمانے کے ابھرتے ہوئے ”غالبوں“ کو خاطر میں نہیں لاتے۔ سلیمان اریب (مرحوم)، محمد علوی
 رفعت سروش، عبداللہ کمال، سب کے ہاں ایک آدھ چھٹا ادھر بھی پڑتا ہے۔ بعضے تو غالب ہی
 غرائے لگتے ہیں۔ مگر معقولیت کا شکوہ وہ ہے جو رؤف خیر نے کیا، سائینٹ ہے ”نذر غالب“
 مخرف ہو چکیں تو رات کی سب آیتیں بھائی
 نئے پیغمبروں پر اب نئے سولے اترتے ہیں
 جو اپنے دور کے معیار پر پورے اترتے ہیں
 نئے معنی دکھاتی ہے نئے لفظوں کی رعنائی

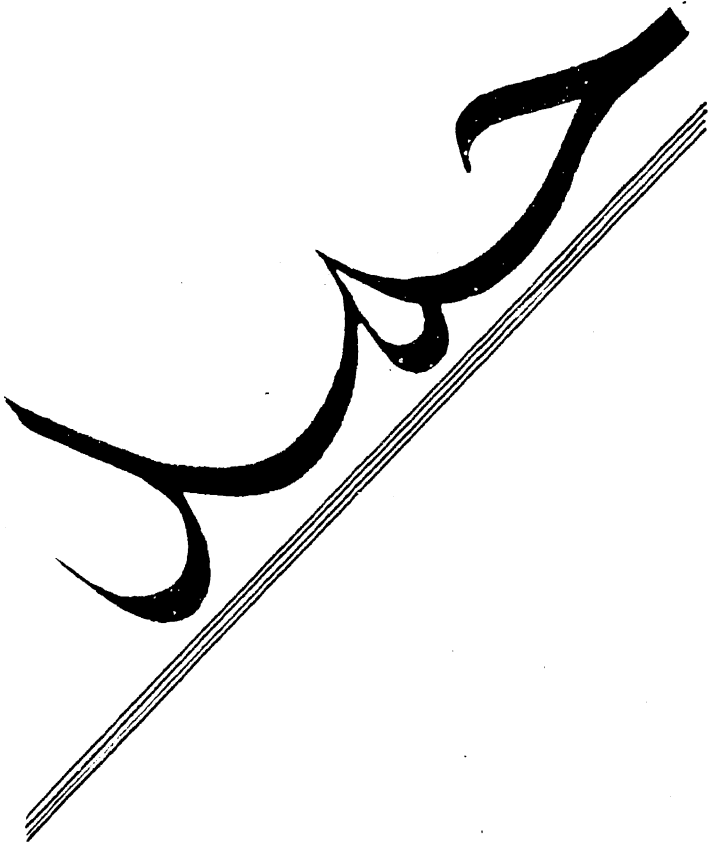
نئی دھوپوں میں پھیلی رات کے سب خواب زرد
 سائل نور کی ہر بوند پی لینے کے عادی ہیں
 ادھر ہم بھی نئے سورج اکا دینے کے عادی ہیں
 کہ ہم ٹھرتے ہیں اپنے قدم سے بڑھ جائیں نہ سہ

غلط ہے یہ کہ ہم ماضی کی تصویریں سچڑتے ہیں
 مگر یہ سچ ہے اپنا درد، اپنا درد ہوتا ہے
 ترے لہجے میں اپنا غم سمونتا ایک دھوکا ہے
 نئے لوح و قلم پیچیدہ تحریریں سچڑتے ہیں

تو اپنے درد کی آواز تھا، یہ مانتے ہیں ہم
 مگر جو غم ہے اپنے دور کا پہچانتے ہیں ہم
 ”کتاب شناسی“۔ اردو بلٹرز، بمبئی، ۳۰ ستمبر ۱۹۷۸ء

دُعائیہ

آنکھ جب دی ہے تو اس درجہ کی بینائی دے
 میں جسے دیکھنا چاہوں وہی دکھلائی دے
 میرے آئینے کو بے پارہ مزاجی سے بچا
 مجھ کو خود رانی نہیں بلکہ خود آرائی دے
 میں کہاں اور کہاں دعویٰ ثابت قدمی
 لاج رکھ لے مری رستہ مجھے بے کافی دے
 کیا کروں لے کے مہ و مہر زوال آما دہ
 جہدِ مور اور مگس کی مجھے صنّاعی دے
 ہشتہ فکر سے بڑھ کر نہیں خوں کا رشتہ
 مجھ کو انصار و مہاجر سا کوئی بھائی دے
 دوستوں کو مرے نادانی کی ذلت سے بچا
 دینے والے مجھے دشمن کی بھی دانائی دے
 آنکھ چمک جائے نہ دے آنکھ کو منظر ایسا
 دل ہی بھر آئے کچھ اتنی بھی نہ تنہائی دے
 بار جانے میں کوئی عار نہیں ہے مجھ کو
 آپ اپنے ہی مقابل مجھے پسائی دے
 ہر بتِ خاک و بتِ پاک سے بیزار ہوں میں
 اس جبین کو کسی در کی نہ جبینِ سائی دے
 سخت دستگیر زمینوں کو نورنگ بھی کر
 خیر کے حرفِ شگفتہ کو پذیرائی دے



لگا حرف ہر اک سبک تر خدایا
 کروں حمد تیری میں کیوں کر خدایا

ترے لئے ہے شہنشاہوں کی شہنشاہی
کسی کو زیب نہیں دیتا راج تیرے سوا

یہ کون ہے جو چٹائی بھی چھین لیتا ہے
یہ کون بھیک میں دیتا ہے تاج تیرے سوا

شفا تو ہاتھ تیرے ہے، کون کرتا ہے
جو لا علاج ہیں، ان کا علاج تیرے سوا

ترے سوائے بھلا کل بھی کون تھا اپنا
جہاں میں کون ہمارا ہے آج تیرے سوا

وہ سر ہے جس میں بھرا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 ادھر ادھر نہ جھکا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 تمام علم کے دروازے اس پہ بند ہوئے
 کہ جس پہ کھل نہ سکا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 ہمارے کفر بھی ایمان کا تقاضہ ہے
 تنہی تو ہم نے کہا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 بنے ہوئے ہیں خدا نفس و آل و مال و متاع
 مگر یہ سر نہ جھکا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 خوش آئے گانہ کوئی اور ذاتِ حق اس کو
 زباں پہ جس کی رہا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 ہمارے ہاتھ میں چابی ہے اسمِ اعظم کی
 وہ کوئی در ہو، کھلا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 ادھر ادھر کو بھٹکتی نہیں نظر اپنی
 رہا ہی دیدنی کیا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 قدم قدم پہ تراشے کئی خدا اس نے
 زباں سے کہتا رہا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 ہمیں تو خیر خداؤں نے گھیر رکھا تھا
 مگر جو ہم نے کہا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ
 رُوفِ خیر مفضل تو کوئی در نہ رہا
 ہنر وہ ہاتھ میں تھا لا اِلهَ اِلَّا اللهُ

میں حاجت مندوں حاجت روا تو مرا مولا، مرا مشکل کشا تو
 بھلا کیسے کسی سے جا کے مانگوں کہ تو کہتا ہے میرے پاس آ تو
 چلوں گراک قدم تیری طرف میں تو میرے پاس آئے بھاگتا تو
 کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے سیجا تو دواؤں میں شفاء تو
 بھلا کوئی بچا سکتا بھنور سے ہمارا ناخدا بھی ہے خدا تو
 تری درگاہ میں بے بس یمیمہ ڈبو دیتا ہے بیٹا نوحؑ کا تو
 محمدؐ نے کہا بیٹی سے اپنی عمل کر تو عمل گرفتار طمہ تو
 تجھی کو المہد کا لفظ زیبا جہاں تجھ کو پکارا آگیا تو
 ضرورت کیا وسیلے کی کسی کے کہ ہے نزدیک شہرِ رگ سے سدا تو
 کوئی دیتا نہیں تیرے سوائے سبھی بے کس غنی الاغنیاء تو
 تو ہی بندہ نواز بندہ پرور تو ہی مولائے کل عوٰث الوریٰ تو

ہوا اپنا جائزہ لیتا نہیں ہے
 دکھا دیتا ہے اس کو آئینہ تو

آپ اپنے کو ٹولا تو یہ قصہ دیکھا
 ایک اک حس پہ مکمل ترا قبضہ دیکھا
 کوئی پردہ نہ علاقہ ہے نہ حد اس کے لئے
 چشمِ بینا نے عجب دیکھنے والا دیکھا
 سننے والا ہے سدا اول و آخر تو ہی
 سننے والا نہ کوئی تیرے علاوہ دیکھا
 چار سو پھیلی ہوئی ہے تو ہے خوشبو تیری
 چار سو چھایا ہوا تیرا سراپا دیکھا
 ذائقہ تیرا کبھی تیرے نمک خواروں سے
 چھوٹتا ہی نہیں چسکا ہی کچھ ایسا دیکھا
 کون ہے تیرے سوا ہاتھ پکڑنے والا
 دستگیری کو ہمیشہ تجھے آتا دیکھا
 تو کوئی روپ نہ بہ روپ کوئی رکھتا ہے
 تو تو وہ ہے کہ ترا باپ نہ بیٹا دیکھا
 خیر ہر دور میں معیارِ حقیقت ہے جہاں
 شریکوں کا وہیں رنگ بھی اڑتا دیکھا

دراصل اک ذرۃ بے مایہ ہوں صحرا تو ہے
سچ تو یہ ہے تشنہ شہد اب ہوں دریا تو ہے

ہر جہد کہ بُت شکنی میں ہوں کفِ ابراہیم
ٹوٹ کے چاہوں جسے کچھ دوست ہی ایسا تو ہے

مخور ہی در نہ تھا نمایاں نہ ہمارے پرکار
تمکمل و تشکیل میں لیتا ہے جو حصہ تو ہے

میری مجال اتنی کہاں منہ تر آگے کھولوں
اتنا پتہ ہے کہ مرے سامنے گویا تو ہے

اب میری پہچان میں شامل تری پہچان بھی ہے
دے قامتِ زیبا کہ پھر آئینے جیسا تو ہے

اے خالقِ مور و نگس صاحبِ کل ارض و سما
گم کردہ راہوں کا فقط لمجا و ماویٰ تو ہے

حمدِ تعالیٰ میں تو شعرا کی سلیقہ کا نہیں
کھل ہی گیا خیر بہت بولنے والا تو ہے

* غیر متداول بحر میں



کوئی لکیر نہیں اس لکیر سے بہتر
ہنریہ ہے کہ ہمارے ہنر میں بھی تم ہو

اعترافِ عجز

میں نعتِ کبہ سکوں یہ مری کیا بساط ہے
عاجز بڑے بڑے ہیں سخنور رسول پاکؐ
ممکن نہیں ادا بھی ہو ماں باپ ہی کا حق
حق آپؐ کا ادا ہو تو کیونکر رسول پاکؐ
قربان میری جاں ہرے ماں باپ آپؐ پر
قربان آپؐ پر مرا گھر بھر رسول پاکؐ

جس میں نہیں ہیں آپ سراسر رسولِ پاکؐ
 وہ آئینہ نہیں ہے برابر رسولِ پاکؐ
 میرے لئے تو پڑھنا بھی گھنا بھی آپؐ
 میرا مکال ہے دھوپ کے رخ پر رسولِ پاکؐ
 گیلی ہے میری خاک تو گردش میں چاک ہے
 پیکر میں ڈھالئے مجھے چھو کر رسولِ پاکؐ
 دل میں اتر کے رہ گیا اترا جو آپؐ پر
 اب کیا پڑھیں صحیفہ دیگر رسولِ پاکؐ
 پیاسے لبوں کو آپؐ سے دو گھونٹ کیا ملے
 حجتا نہیں ہے کوئی سمت در رسولِ پاکؐ
 میں آپؐ کے بغیر ادھورا تھا ہر جگہ
 پورا ہوا ہوں آپؐ سے مل کر رسولِ پاکؐ
 ہم وہ غلام بیعت و نسبت ہے آپؐ سے
 ہم خاک چھانتے نہیں در در رسولِ پاکؐ
 چلنے لگا ہوں آپؐ کی انگلی جو مقام کمر
 گم ہو سکوں گا بھیڑ میں کیوں کر رسولِ پاکؐ
 کب خیر مہر و ماہ کے سیکوں میں یک سکا
 قیمت لگا چکا ہے بہت شر رسولِ پاکؐ

کیا تھا کس نے گھنٹی تیرگی کو رد کہتے
 اس آدمی نے جسے نور مستند کہتے
 اسی کی آنکھ میں تھا شام بے چراغ کا درد
 وہ صبح جس پہ نثار آفتاب صد کہتے
 زمین کو بخش دیئے اس نے آسمان کے راز
 اب اور رہ گئی کیا جستجو کی حد کہتے
 کوئی شعورِ حیات اس سے گر نہیں لیتا
 اسے شعورِ نظر ہی سے نابلد کہتے
 وہ نیک خو کہ بھلا چاہتا رہا سب کا
 تڑپ کے رہ گئی کیا کیا نگاہ بد کہتے
 وہ جس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے بونے
 اسے شعورِ مکمل ”نگاہِ قد“ کہتے
 ملیں گے یوں تو کئی راستے میں چور ہے
 جو اس کی راہ نہیں راہِ مسترد کہتے
 ہزار کوششیں کر لی ہیں خاک زادوں نے
 کہیں پڑی ہے سمندر پہ کوئی زد کہتے
 صدائے خیر سنیں طالبانِ منزل کو
 قدم اکھڑنے لگے ہوں تو المدد کہتے

لہ المدد کا لفظ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں میری بھی یہی مراد ہے۔ بخیر

ملنے نہیں حروف ہی شایانِ مصطفیٰ لاؤں کہاں سے لہجہ حسانِ مصطفیٰ
ایک ایک حرف ہے ادبِ تانِ مصطفیٰ اہلِ زبانِ ٹہرے زباں دانِ مصطفیٰ

شاید ہے حرفِ حرف کہ شاعر نہیں ہیں آپ
پھر بھی صحاحِ ستہ ہیں دیوانِ مصطفیٰ

ساجر نہیں ہیں آپ یہ ایمان ہے مرا
شقِ القمر ہے معجزہ و شانِ مصطفیٰ

کاہن نہیں ہیں آپ یہ دنیا گواہ ہے
لیکن ہوا وہی جو تھا فرمانِ مصطفیٰ

اللہ کی زبان، تربانِ رسول ہے اللہ کا کلام ہے فرمانِ مصطفیٰ
دیکھا گیا کہ دیدہ و دل پر ہیں حکمراں شاہوں سے بچی سواہیں غلامانِ مصطفیٰ
درویش کی متاع تو ہے قلبِ مطمئن

ہے بے نیاز بے سروسامانِ مصطفیٰ

اک آفتابِ رشد و ہدایت ہے درِ بغل

وہ سینہ صفا ہے کہ جز دانِ مصطفیٰ

ٹھہری ہے علمِ سینہ بہ سینہ یہی کتاب

اس کے سوائے کچھ نہیں فرمانِ مصطفیٰ

اب کیا کسی کے ہاتھ پر بیعت کرینگے ہم ہم تے تو کی ہے بیعتِ رضوانِ مصطفیٰ
تکتا نہیں ہے اس میں کسی کا حسبِ نسب میزانِ مصطفیٰ ہے یہ میزانِ مصطفیٰ

گردن جھکی ہوئی ہے تو آوازِ پست ہے

اٹھتا نہیں ہے خیر سے احسانِ مصطفیٰ

جتنے رستے ہیں سب پر خط مصطفیٰ
آپ کی رہ گزر رہ گزر مصطفیٰ

واردی جان بھی آپ پر مصطفیٰ
اب عمر ہو گئے ہیں عمر مصطفیٰ

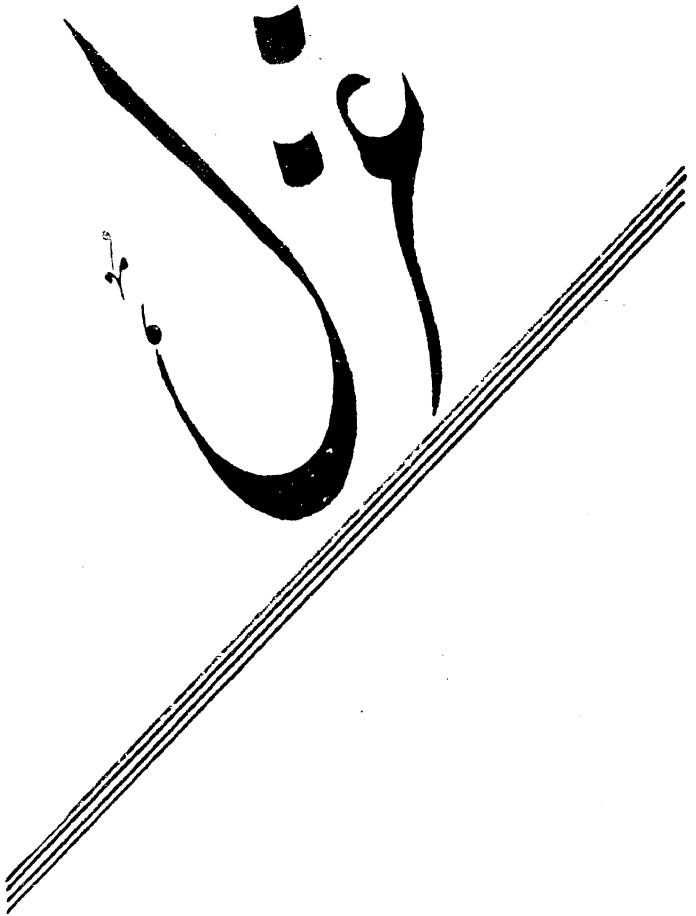
سب کھرے اور کھوٹے کی پہچان دی
آپ نے دی ہمیں وہ نظر مصطفیٰ

آنکھ پر بوجھ تھے ٹٹماتے دیئے
آپ آئے تو آئی سحر مصطفیٰ

ہے مدینہ ادھر اور کعبہ ادھر
ہے ادھر گھر ادھر مستقر مصطفیٰ

ڈھل گئے چاند تاروں میں ذرے کئی
بے خبر حجب ہوئے باخبر مصطفیٰ

آپ کا ساتھ ہے خیر ہی خیر ہے
اب کہاں شر کا کوئی گزر مصطفیٰ



کوئی خدائے سخن کوئی فاطمہ الشعراء
تو خیر کیا مرے حرف بہر میں خاک نہیں ہے

کو نیل بھی تخریب کی پھوٹی ہے دیکھو تعمیر کے پاس
 کیسے پچھورینگ رہے ہیں پُر گھوں کی جاگیر کے پاس
 بھاگ متی کی یاد آئی ہے قلی قطب کی گنبد میں
 اپنا نام بھی لکھا دیکھا جب تیری تحریر کے پاس
 جب سے تو نے اس پانی سے اپنا تاتا نوڑ لیا
 میں بنجارہ پیاسا پیاسا بیٹھا ہوں مانیر کے پاس

جو ترے نام نہیں وہ مری عبارت کیا
تجھے نہ دیکھ سکوں تو مری بصارت کیا

میں ایک خشتِ سہی جذب ہوں ترے اندر
مرے وجود سے ہٹ کر تری عمارت کیا

قلم میں ہاتھ تو حرفِ ہزار معنی ہم
رہے گی اب تری دیوار بے عبارت کیا

مہاجرین سے انصار خوش نہیں ہوتے
تو پھر کہاں کی یہ ہجرت برا ہے بھارت کیا

عذاب ہو گئیں راتیں خراب ہو گئے دن
ترے بغیر کوئی خواب کیا بشارت کیا

تباہ ہو گئے خیمے چراغ ہو گئے گل
ہوا کرے گی بھلا اور اب شرارت کیا

رگوں میں خون اچھلتا رہے تو بہتر ہے
یہ رکھ رکھاؤ پس اندازیِ حرارت کیا

خوشی یہ ہے کہ تری دسترس میں ہوں یوں بھا
مری اڑان ہی کتنی مری جارہی تھی کیا

اُسے خرید لیا خود کو زینچ کر ہم نے
ہے اور اس سے زیادہ بڑی تجارت کیا

رہیں گے ہم کسی صورت یہیں کہیں نہ کہیں
کرے گی خلیں یہ مٹی ہمیں اکارت کیا



سحر کو بادِ صبا نے مجھے بکھیر دیا
میں اپنی خاک بٹھالے ہوئے تو رات سے تھا

بچا ہوا سے تو دھوپوں کی زد میں آ کے گرا
وہ برگِ سبز جو موسم کی باقیات سے تھا

وہ مر گیا تو خدا ہو گیا ہزاروں کا
وہ شخص اپنے ہی جیسا تھا جب حیات سے تھا

وہ بات ادھر ہی ہے جو تمہیں سنانا ہے
 سخنوری تو مری بات کا بہانا ہے
 جو ایک دیوتا سرس کا شیر ٹھیرا ہے
 ہوا کے ہاتھ میں یہ کیسا تازیانہ ہے
 ہمیں سنبھال کہ ہیں شاہکارِ کوزہ گری
 ہماری خاک تری آگ سے توانا ہے
 کوئی نشان لگاتے چل دو رختوں پر
 کہ اس سفر سے تمہیں لوٹ کر بھی آنا ہے
 چلے جو ہم تو کسی نے دواغ بھی نہ کیا
 ملاں یہ کہ ہمارا سفر سہانا ہے
 سدا ہمارا ہے اس کے سخن کی ہریالی
 وہ میرے واسطے موسم نہیں زمانہ ہے
 مجھے تو چھوڑ کم از کم سنبھال تو خود کو
 میں بے ٹھکانہ بھی کچھ ترا ٹھکانا ہے
 غزل تو جیسی بھی کہتا ہے وہ تو ظاہر ہے
 رؤف خیلر کا لہجہ بھی شاعرانہ ہے

اب اسقدر بھی تو فغانِ خراب ہم نہ ہوئے
ملاں یہ ہے تمہیں دستیاب ہم نہ ہوئے

کتاب ہم نہ ہوئے انتساب ہم نہ ہوئے
ترے لئے نگہِ انتخاب ہم نہ ہوئے

ہمیں قریب سے دیکھو کہ دور سے دیکھو
کبھی کسی کے لئے بھی سرب ہم نہ ہوئے

ہمارا عشق تو سچا تھا عسر کچھ تھی
ہزار میل تھا غرقِ چتاب ہم نہ ہوئے

ہماری راہ میں روڑے خرد نے اٹکائے
قدم قدم پہ جنوں اجتاب ہم نہ ہوئے

اسی ملاں میں آٹھوں پہرہ کتنے ہیں
اس ایک دشت کے حق میں سحاب ہم نہ ہوئے

ہنر ہی ایسا ہے چمکا ڈروں پہ کیا کھلتا
روں خیر چلو آفتاب ہم نہ ہوئے

عجیب درد اٹھالائے داغ کے بدلے
نیا چراغ پرانے چراغ کے بدلے

پتہ نہیں یہ امیری ہے یا غریبی ہے
اُسے نصیب ہے سب کچھ فراغ کے بدلے

ہمیں یہ علم ہے کس حرف کو کہاں برتن
دماغ رکھ نہیں دیتے ایاغ کے بدلے

یہ مانا ہو گا پہاڑوں کے اس طرف سب کچھ
برائے ہی کیا ہے یہ گھر ستر یاغ کے بدلے

ہر ایک بات مدلل نہیں ہوا کرتی
کبھی تو دل کی بھی سن لو دماغ کے بدلے

وہ رات کٹ گئی اس کو تو خیر کٹا تھا
اب آفتاب سنبھالو چراغ کے بدلے

پتے تمام حلقہ صرصر میں رہ گئے
 ہم شاخ سبز میں شجر تر میں رہ گئے
 گھر کر جو ہم سپاہ سکندر میں رہ گئے
 ہاتھی ہمارے اپنے ہی لشکر میں رہ گئے

لکھ لینا اس قدر وہ سفینے نہیں مرے
 ساحل پہ رہ گئے جو سمندر میں رہ گئے
 آثارِ یک خرابیہ آباد ہو کے ہم
 سینوں میں رہ نہ پائے تو پتھر میں رہ گئے
 اس لذتِ سفر کو میں اب ان سے کیا کہوں
 جو سایہ ہائے سرو صنوبر میں رہ گئے
 باہر ہی چھوڑ آئے وہ چہرہ جو خاص تھا
 اک عام آدمی کی طرح گھر میں رہ گئے
 تم تو آنا کا ایک جزیرہ ہو، سوچ لو
 ایسے کئی جزیرے سمندر میں رہ گئے
 رسوا انھیں بدن کے تقاضوں نے کر دیا
 کیا لوگ تھے کہ ٹوٹ کے پل بھر میں رہ گئے

ابھی لنگاہ کو پیغمبرانہ ہوتا ہے
 کہ فلسفوں کو ابھی عامیانا ہوتا ہے
 میں ایک پورا ہوں بلے میں سانس لیتا ہوا
 کہ اس کھنڈر میں مجھے بھی خزانہ ہوتا ہے
 عجب پرزدہ ہے ہر زدے پرچ نکلتا ہے
 پتہ نہیں اسے کس کا نشانہ ہوتا ہے
 ہمیں اندھیرا ہیں یہ طے ہے آپ سورج ہیں
 ہمارا ہوتا مگر آپ کا نہ ہوتا ہے
 میں چپ نہیں ہوں کہ اس دور ابتلا میں مجھے
 حریف خامشی مجرمانہ ہوتا ہے
 بھلا دیا ہے کسی نے تو کوئی غم نہ کرو
 ہر ایک شخص کو اک دن فسانہ ہوتا ہے
 سنو یہاں سے مر دو ستوا جازت دو
 مجھے تلاش میں اپنی روانہ ہوتا ہے
 رؤف خیرِ حلویہ بھی اب غنیمت ہے
 بھلائی کہتے ہیں جس کو برا نہ ہوتا ہے

رستے میں تو خطرات کی سن گن بھی بہت تھے
منزل پہ پہنچنے کی تہیں دھن بھی بہت تھے

ہر شہر میں تازہ ہے تو بس زخمِ تعصب
کچھ لذتِ ناخن کا تقاؤں بھی بہت ہے

کچھ ہاتھوں سے کچھ ہاتھوں کا لک نہیں جاتی
ہر جید کہ بازار میں صابن بھی بہت ہے

وہ ہاتھ تحفظ کی علامت جسے کہتے
محسوس یہ ہوتا ہے وہی سن بھی بہت تھے

اک جسم کے مانند ہیں ہم لوگ کہیں ہوں
ٹھوکر سے اکھڑتا ہے تو ناخن بھی بہت تھے

ہم شعر کہا کرتے ہیں وجدان کے بل پر
کچھ لوگوں کو زعمِ فعلاتن بھی بہت تھے

بہت دنوں سے کچھ ایسا پتہ نہیں ملتا
کنجی تو چہرہ کنجی آئینہ نہیں ملتا

یہ سچ تو ہے ترے کوپے میں کیا نہیں ملتا
سوال یہ ہے کہ کوپہ ترا نہیں ملتا

وہ آب جو ہوں کہ جس میں ہزار جھرنے ہیں
تو تشنہ لب ہے تو کیوں مجھ سے آہیں ملتا

کئی درپے کئی در میں اس کی آنکھوں میں
بھٹک گیا ہوں کہاں راستہ نہیں ملتا

کبھی بدلتا ہے منظر کبھی تو پس منظر
کہیں بھی سلسلہ نقش پا نہیں ملتا

ملے خطوط و رسائل تو کونے کونے سے
بس ایک خط ترا لکھا ہوا نہیں ملتا

وہ شخص خیال میں غیری نہیں لگتا
ہزار اس سے کوئی سلسلہ نہیں ملتا

نہ ہی مینار نے کلس کا ہے
مسئلہ نفس اور نفس کا ہے

کتنا پیچھے ڈھکیل دیتا ہے
ایک لمحہ جو پیش و پس کا ہے

اس پہ ہر چیز نام ہے میرا
یہ بدن ایک ایک نفس کا ہے

تیرے ساتھ نکل پڑے کب کے
اور تو منتظر جس کا ہے

تو اگر کرشن ہے تو تیرے لئے
منتظر ہر مکان میں مسکا ہے

میں کہاں رام کی تلاش میں ہوں
یہ علاقہ تو راکشس کا ہے

گل سمجھتا ہے یا اسے متلی
لمس تک فاصلہ جو لمس کا ہے

مناش کا گھر نہ تھا گھر و نہ تھا
دکھ ہوا کو تہس نہس کا ہے

ہر تماشا ہمارے بس کا تھا
ہر تماشا ہمارے بس کا ہے

دیکھ لیکن نہ دیکھنے کی طرح
مشورہ چشم بے ہوس کا ہے

ایسی ویسی غزل نہ کہہ کہ ہمیں
ماورائے سخن کا چسکا ہے

خیل پھر کیا فریب کھاؤں گا
تجربہ خوب اس برس کا ہے

جانے کیا راز تھا کچھ اس نے بھی پھیکا لکھا
ہائے کھانا نہیں ہم پر بھی تو جی کا لکھا

ہم کہاں حرف شناس اتنے بگڑے ہتھ ہیں
کاغذوں پر ترے ہاتھوں کی نمی کا لکھا

دن کو باز اسے ہو کر بھی گزرنا ہے تجھے
اپنے چہرے سے مٹا تیرا شبی کا لکھا

ہم نے ویسے تو بہت خود کو بچانا چاہا
ایک اک حرف ہوا خود شکنی کا لکھا

سایہ سایہ تجھے ترے یہ الگ ہے لیکن
ہم تے سورت کو ترے ماتھے کا ٹیر کا لکھا

وہ سنا شہرت کی زباں بھول گیا
خیر گزری کہ اسے حال نہ جی کا لکھا

پاس جاں اتنا تھا یا روک بھی کم ہی ملے
ان پہ کھلنے نہ دیا دستِ نہی کا لکھا

ہم اس زمینِ شریہ بھی ہیں خیر کی طرح
ہم کو نہ بانٹئے حرم و دیر کی طرح

ہم ایک دوسرے کے حوالے سے ہیں یہاں
ہم کو نہ دیکھئے گا کبھی غیر کی طرح

دے کر ازاں بھی دیکھ، جلا کر لاؤ دیکھ
صحرا سے سرسری نہ گزر سیر کی طرح

لوٹے جو تتلیوں کے تعاقب سے تو کھلا
چھالے ہتھیلیوں میں بھی ہیں پیر کی طرح

تیرا خیال پھر ہمیں آباد کر گیا
اک شاخ سبز لاتے ہوئے طیر کی طرح

انسان ہی تو ہیں کوئی اوتار ہم نہیں
دل میں ہماری بات نہ رکھ بیر کی طرح

رستے سے بھید بھاؤ کے پتھر ٹپائے
کوئی بہو لہان نہ ہو خیر کی طرح

المیہ فنا مری ذات پے بہ پئے
نظر یہ بقا ترے نام ہی تو ہے

ترے رکھ رکھاؤ میں کہ مرے سبھاؤ میں
غلطی کہاں ہوئی یہی ہو سکا نہ — طے

کسی کنج عافیت سے نکل کے دیکھئے
جو حریف جامِ ممئے ہے وہی حریفِ کئے

ہوں نہالِ منکسر، نہیں سیل میں شجر
میں سمے کا دوست ہوں مراد دوستِ سمے

کہیں جیتنا نہیں، کبھی ہارنا نہیں
یونہی اپنے آپ سے کوئی جنگِ تالکے

مری ہجرتوں کا دکھ نہ سمجھ سکا کوئی سے
پس پردہٴ سفر کوئی ہے کوئی تو ہے

میں رؤفِ خیر ہوں کوئی شے نہیں شر
نہ پنپ سکا کبھی مرے راستے میں بھٹے

فرد تنی مری دشمن کو مستہ کرتی ہے
 بڑے ادب سے وہیں روک کر کرتی ہے
 وہ شام جس نے سنبھالے ہوئے رکھا ہے ہیں
 کبھی کبھی تو بہت تیرا ذکر کرتی ہے
 یہ رکھ رکھاؤ بھی ملنے سے روکتا ہے ہیں
 یہی انا ہے جو مائل بہ ہجر کرتی ہے
 مجھے یہ منکر کہیں شاخِ بے نمونہ رہوں
 یہی زمین بھی کیا میری منکر کرتی ہے
 ملال یہ ہے کہ آسودہ ہے وہ چنگاری
 جلا کے خاک جو یونان دمصر کرتی ہے
 قدم قدم پہ کلمی رہی جوازِ طلب
 پیمبری کہیں تقلیدِ خضر کرتی ہے
 بہ ہر لحاظ سلیقہ ہی شرط ہے ورنہ
 غلط مذاقی بھی تو ہیں عطر کرتی ہے
 نکال سر سے یہ بادِ شمال کا سودا
 دکن کی خاک بھی تکریمِ حبر کرتی ہے
 روفِ خیر عقیدے کی ضرب ہے ایسی
 عدد بڑا بھی اگر ہو تو صفہ کرتی ہے

میں کانچ کا گھڑبوں مجھے تھپسے سے بچانا
 باہر سے بچانا مجھے اندر سے بچانا

ہوتا ہے اسے جذب تو کرنا ہے اسے جذب
 دریا کو بھلا کیسے سمت در سے بچانا

رستے میں مسافر کو کہیں نیت نہ آئے
 یوں نشہ اسبابِ ملیں در سے بچانا

سرتاب قدم میں تو فقط ایک بھرم ہوں
 پڑ جائے جو چھوٹی اُسی چادر سے بچانا

آئے نہ کوئی حرف تری کوزہ گزرا پر
 میں ٹوٹ نہ جاؤں کہیں ٹھوکر سے بچانا

سچ پوچھو تو ایک اپنی ہی مٹی میں مزہ ہے
 اب ذائقہ کو چہ دیگر سے بچانا

تو دوست ہے دشمن کے حوالے مجھے مت کر
 میں خیاں ہوں یا رب مجھے ہر شر سے بچانا

کتاب جاں کا اے صفحہ نعلط لکھنا
اگر نہیں ہیں کہیں اپنے دستخط لکھنا

شکایتیں ہیں تو حرفِ صحیح سے کیا کیا
مزدہ تو دیتا تھا تیرا نعلط سلط لکھنا

تمام دن ترا چہرہ درق ورق پڑھنا
وہ رت جگادہ مرا رات بھر فقط لکھنا

خبر بھی ہے کہ یہ آنکھیں ترس گئیں تھکو
ہیں کس حساب میں اب اپنے خال و خط لکھنا

صد ہی سو تپ بھی کما سے سماعت کو
بچے جو غیر سے آتا نہیں ہے خط لکھنا

بھلا ہوا ہے خداؤں کا خوش گمانوں سے
وہ کیا ہے منس کہ بگلا بھگت کہ بٹ — لکھنا

گرفت میں جو نہ آئے ہرے خیال دی
جوبات کہنی ہو کر کے خلط ملط لکھنا

ناؤ چھوٹی سی سی ہی پانی سمندر کی ہے
 مجھ کو دریا کی یہ آبستہ روئی سکتی ہے
 اک ہی بات ترے پاس مجھے لاتی ہے
 خوش مذاقی تری خوبی مری کمزوری ہے
 اجنبیت ہو تو دہلیز بھی ڈس لیتی ہے
 کوئی ساتھی ہو تو ہجرت بھی مزہ دیتی ہے
 اس نے بیٹی کو ضرورت کی تو ہر شے دی ہے
 تیل مٹی کا بھی سامان میں ماچس بھی ہے
 میری مٹی بھی تری کوزہ گری بھی نیری
 اب حرارت مرا اندر تجھے بھر دینی ہے
 اک گزارش ہے کہ دھرتی پہ لکیریں مکتیج
 حق تو یہ ہے کہ ہماری بھی جہنم بھونی ہے
 مسئلہ یہ ہے کہ میں چپ بھی نہیں رہ سکتا
 اور کہتا ہوں تو خاطر شکنی ہوتی ہے
 اور دیتا ہے مزہ آج سلیقہ اپنا
 ہائے کیا لذت ہے راہ روی ہوتی ہے
 ہم کو جو بے سرو سایہ نہیں ہونے دیتی
 خیل دیوار پرانی ہی سہی گھر کی ہے

کہاں سے پاؤں پیساریں کہ گھر میں خاک نہیں
 شکل پڑیں تو مزہ بھی سفر میں خاک نہیں
 اسے یہ کیا کرتی رہ گزرتی خاک سے نہیں
 تو پھر ہمارے لئے بحر و بر میں خاک نہیں
 زمیں کو پاؤں پکڑنے نہیں دیا میں نے
 ہنریہ ہے کہ مرے بال و پر میں خاک نہیں
 میں بے نمونہ رہا سرمہ درگھونہ رہا
 زمین شور بھی میری نظر میں ناک نہیں
 ہمارا رونا ہی ہے کہ تر نہیں دامن
 بڑا غبار ہے دل پر کہ سر میں خاک نہیں
 خمیر خاک سے کیا کیا نہ شاہکار اسٹھے
 کمال ہے کہ کف کوزہ گر میں خاک نہیں
 کہاں کہاں نہ تو اناتیاں تمام ہوئیں
 شر ہے خاک میں کیا کیا شر میں خاک نہیں
 طبیعت اپنی تھی آمادہ خاک اڑانے پر
 مگر کھلا کہ ہمیں شہر بھر میں خاک نہیں
 ہم اپنے آپ کو منوا نہیں رہے ہیں اگر
 تو پھر یہ طے ہے کہ دستِ ہنریہ خاک نہیں
 کوئی خدائے سخن کوئی خسا تم الشعراء!
 تو خیر کیا مرے حرفِ ہنریہ میں خاک نہیں

کھل گیا ہم سے بہر حال جو سب سے نہ کھلا
 ہاں وہ شخص خدا جانے جو لب سے نہ کھلا
 وہ کھلا شہر تھا چیک پوسٹ نہیں تھے جس کے
 کوئی دروازہ جہاں نام و نسب سے نہ کھلا
 شعرِ مبہم وہ نہ تھا حرفِ مذہب بھی نہ تھا
 جو کسی ڈھب سے کھلا اور کسی ڈھب سے نہ کھلا
 میری پہچان ہی کیا تیرے حوالے کے بغیر
 میں کسی پر بھی مگر تیرے سبب سے نہ کھلا
 کچھ تو ہم نے بھی تکلف سے بہت کام لیا
 اور وہ شخص بھی کچھ پاسِ ادب سے نہ کھلا
 اسمِ اعظم ہے عجب شاہِ کلیدی اپنی سے
 ہم پہ وہ در بھی کھلا جو جدِ آب سے نہ کھلا
 فرقِ اک روزِ دیوار سے کیا کیا نہ پڑا
 جو عجم سے نہ ہوا بندِ عرب سے نہ کھلا
 خلیں یاروں نے پہاڑوں پہ پہاڑ سے لکھے
 چاہتے کیا ہیں کبھی شعرِ ادب سے نہ کھلا

ہمارے نام سے پردہ کہاں اٹھاتی ہے
 اسی جگہ تو کہانی بدن چراتی ہے
 ادھر ادھر کو بھٹکنے کبھی نہیں دیتی
 وہ بوئے خوش بدنی راستہ دکھاتی ہے
 خطا دہیں سے تو اندھے کے تیرہوتے ہیں
 جہاں سے نیک گمانی فریب کھاتی ہے
 یہ کوٹنا ہے کہ کُٹنا ہے کہہ نہیں سکتے
 خدا گواہ ترا حسن سو مٹاتی ہے
 غلط سلط بھی کبھی فیصلے ہوئے ہم سے
 مزاج اپنا ذرا غیر تجزئیاتی ہے
 کسی طرح سے سہی دن گزر ہی جاتا ہے
 مگر وہ رات کہ جب نیند ٹوٹ جاتی ہے
 انا کے ہاتھ میں تلوار ہے جو دو دھاری
 کبھی کبھی تو خود اپنا لہو بہاتی ہے
 کوئی کتاب ہو بین السطور ہی پڑھیے
 یہ راکھ وہ ہے جہاں آگ منہ چھپاتی ہے
 کسی طرح تو کرائے کی علتوں سے بچے
 نواحِ شہر میں اک گھر تو خیل و ذاتی ہے

ترا خیال ہی دل سے نکل گیا جیسے
ہمارے شعر کا مصرع بدل گیا جیسے

سفر میں اس کا کلیجہ دہل گیا جیسے
بھنور سے پنج کے وہ پہلے پہل گیا جیسے

یہ کس کا روشنی دیتا ہوا سا پس کر ہے
چراغ سا کوئی رستے میں جل گیا جیسے

سفید گھوڑے کی زد میں ہیں بادشاہ و وزیر
اڑھائی گھر کی کوئی چال چل گیا جیسے

سُنا ہے جب سے کہ کائی بھری زمین ہے تو
بڑے بڑوں کا بھی پاؤں پھسل گیا جیسے

نئی کہانی نئی رات پھر نیا لہجہ
خلاف قصہ ضرب المثل گیا جیسے

زبان پھیر رہا تھا وہ خشک ہونٹوں پر
ہمارا حرف تروتازہ کھل گیا جیسے

تشنہ رہیں گے اپنے بگڑنے کے مرحلے
آئے جو ہیں نگاہیں پڑنے کے مرحلے

میرے لئے زماں و مکاں پھیلنے لگے
طے ہو رہے ہیں تجھ سے بچھڑنے کے مرحلے

یہ چھالا چھالا پاؤں یہ باتھوں کی سختیاں
یاد آئے تتلیوں کے پکڑنے کے مرحلے

آنکھوں میں ریت بھر گئی ہمدرد تھی ہوا
نادیدنی تھے خیمے اکھڑنے کے مرحلے

پھر جیسے پتھروں کے حوالے ہوئے ہیں ہم
نازک تھے آئینے سے بچھڑنے کے مرحلے

خود کو سنبھالنا بھی قیامت ہے ان دنوں
اب ہم ہیں اور آگ پکڑنے کے مرحلے

خوش تھے روف خیل جو دنیا سے لڑ چکے
باقی ہیں اپنے آپ سے لڑنے کے مرحلے

یہ سچ ہے رہنے کو رہتا ہے اب بھی تو مجھ میں
کوئی پرندہ ہے جیسے لہو لہو — مجھ میں

یہ ریگ زار پینے مجھے کہاں دیتا
ابل پڑی وہ جو تھی قوتِ نمُو مجھ میں

ہو کوئی سئلہ مجھ کو تو اب لگتا ہے
کہ دو حریف ہیں مصرفِ گفتگو مجھ میں

ہو ابس اتنا کہ آنکھوں میں جم گئی آکر
نہ رہ سکی مرے اندر کی ہاؤ ہو مجھ میں سے

نہ آگ ہے نہ دھواں اب رہے نہ ریگِ رواں
بھٹک رہا ہے اک سیبِ آرزو مجھ میں سے

وہ تجربے ہیں کہ جی مصلحت پسند نہیں
رہی نہ اب وہ مروت جو تھی کبھو مجھ میں

عائد کسی طرح کی بھی خرید و مت کرو
کیا دوست۔ دشمنوں پہ بھی تنقید مت کرو

بیعت کرو تو ایک ہی دستِ رسول پر
دورِ کعتی امام کی تقلید مت کرو

کھینچو بڑی لکیر۔ لکپروں کے درمیان
چھوٹی کسی لکپڑ کی تردید مت کرو

بے رس جنھیں ہوائے زمانہ نے کرویا
اب اُن تلّوں سے تیل کی امید مت کرو

جگنو ہے ہاتھ میں یدِ بیضا نہیں کوئی !
اندھیر ہے اہانتِ خورشید مت کرو

جب دھوپ پی چکے ہو تو پھر دودھ بھی پیو
کس نے کہا کہ خیر سے تم عید مت کرو

درپیش ایک چشمہ زہراب ہے مگر
یہ تشنہ لب تو خورِ گرِ شہد اب ہے مگر

وہ حرفِ جاں گداز و جہاں تاب ہے مگر
اک آئینہ کہ زینتِ محراب ہے مگر

ثابت ہوا کہ اپنے خدو و خال ٹھیک ہیں
مانا وہ آئینہ کس ہی بے آب ہے مگر

اس سے جو ہے وہ سطحِ ملاقات اور ہے
وہ بھی شریکِ حلقۂ احباب ہے مگر

کہنا ہے یہ وہ چہرہ کتانی اگر ملے
تیرا جواب آیتِ نایاب ہے مگر

صحرا ہے بے کلیم نہ گلزارِ بے خلیل
کیا کیا گمانِ شعلہ شاداب ہے مگر

یہ اور بات ہے وہ خرابِ خمارِ خواب
میراثِ خیرِ دیدہ بے خواب ہے مگر

ہم نے کب حرفِ پس و پیش کا احسان لیا
 مان لینا جسے چاہا ہے اُسے مان لیا

آنکھ جھپکی تھی کہ سورج تھا سوانیرے پر
 خواب دیکھا کہ مسافت نے بُرا مان لیا

صاحبو! منزل نازک سے گزرنا دیکھو
 ہاتھ دامن سے اٹھایا تو گریبان لیا

کہہ دیا تیرے جھمکنے کا ڈاڑھ لیا کیا
 حرفِ ناگفتہ سے مجھے پہچان لیا

شبا ہتیں تو بہت کچھ ہیں بھائی بہنوں میں
بلا کا فرق بڑے فاصلے ہیں ذہنوں میں

گھرا ہوا ہے وہ خوش پوش کن برہمنوں میں
دریدہ پیرہنوں میں دریدہ دہنوں میں

یہ پھول تنگی گلدان کا شکار ہوئے
کمری بھی کیا کہیں مٹی نہیں ہے صحنوں میں

ہے سونا سونا حقیقت میں پور پور اس کا
سمجھ رہا ہے ہی وہ لگن ہے گمنوں میں

مجھے لپیٹ لیا اس نے اپنی چادر میں
مرا شمار کہاں رہ گیا برہمنوں میں

وہ آب جو تھی سمندر سے ہمکنار ہوئی
زمین پکار رہی تھی اداس لحنوں میں

یہ قافیے ہیں غزل کے! یہ حرکتیں کیا ہیں!!
یہ چاند اور یہ سورج ہیں خیر گمنوں میں

اب وہ دلی ہے نہ لاہور چنا جو رگرم
خاک اڑتی ہے ہر اک اور چنا جو رگرم

جنگلوں میں بھی تو بارود کچی رستی سے
رفق کرتے نہیں اب مورچنا جو رگرم

خون میں جس کو نہانے کا ہنر آتا تھا
ہے پسینے میں شرابورچنا جو رگرم

پھر سرفراز ہوئے آکے نکالے ہوئے بت
پھر اٹھا شورچنا جو رگرم

رات کی کوکھ سے سورج کو حنم لینا تھا
ہم نے دیکھی ہی نہیں بھورچنا جو رگرم

عزیز شہر میں نیلام ہوتی جاتی ہیں
عشق بے چارہ ہے کمزورچنا جو رگرم

سے سرِ تِلّ الہی پہ گدھوں کا سایہ
ہو گئے ڈھیر بھی ڈھور چیا جو گرم

دم لیا تھا نہ اچھی مٹر کے گھر والوں نے
پھر گھٹا چھائی ہے گھنگھو چیا جو گرم

اک لٹکتی ہوئی تلوار کے نیچے سر ہے
ٹوٹ جائے نہ کہیں ڈور چیتا جو گرم

ہجرتیں راس بھلا سب کو کہاں آتی ہیں
وہ بھی ہیں زندہ و درگور چیا جو گرم

خیر صاحب یہ ترا جوش برا ہوتا ہے
آپ بھی ہو گئے منہ زور چیا جو گرم



یہ آسمان تو کچھ بھی نہیں ہے میرے لئے
لہو کا زور میرے بال و پیر میں اتنا ہے

بے اختیار آنکھ سے نادرہ دیکھنا
 پرکھوں کی جانب راہ کو بوسیدہ دیکھنا
 دیدہ دلیری سربے دیدہ دیکھنا
 بے آب آئینے میں ہے غلطیدہ دیکھنا
 پانی پہ خدو خال کے سب محسوس کئے
 کیا کیا ہے اپنے آپ سے پوشیدہ دیکھنا
 پردہ عذاب ہے پس پردہ عذاب سے
 مشکل ہے ماورائے دل و دیدہ دیکھنا
 بے آج بے گیارہ علاقے میں سے آگے
 کیا دن دکھا گیا سرشوریدہ دیکھنا
 اک لذت تمام ہے آنکھوں کے واسطے
 بے خواب دیکھنا تجھے خوابیدہ دیکھنا
 ہم نے سب اپنا درد مہنسی میں اڑا دیا
 اچھا نہیں لگا اسے رنجیدہ دیکھنا
 پڑتی ہے جب بھی شوخ مناظر پہ یہ نظر
 آتا ہے یاد وہ ترا در دیدہ دیکھنا
 تو تو ہے شوخ طبع بلا کار و فخر
 خود اک مذاق ہے تجھے سنجیدہ دیکھنا

اٹھے ہیں تیل کی ترائی سے
دوستی کو دیا سلائی سے

کیا پرست بنا ہے رائی سے
لیجئے پھر ٹھن گئی ہے بھائی سے

خوش گمانی سے ہم نے کام لیا
اس نے دھوکا دیا صفائی سے

ہم مہاجر نہ تم کوئی انصار
بات کر لو ذرا بھلائی سے

خیر اپنی منتار ہا ہے غیر
میں جو الجھا ہوا ہوں بھائی سے

بے وفا خیر ہم بھی تھے لیکن
دکھ ہوا اس کی بے وفائی سے

اس سبیل بے اماں کا بہاؤ بھی مان لو
پھر مجھ کو ایک نوح کی ناؤ بھی مان لو

یہ چوب آتشیں یہ دھوئیں کی گواہیاں
جنگل میں قسافلے کا پڑاؤ بھی مان لو

تا پے اگر ہیں ہاتھ تو دل بھی اُجالتے
جب آگ مان لی ہے الاؤ بھی مان لو

خالی مکان دیکھ کے آسیب گھس نہ جائیں
پر دیو! پلٹ کے اب آؤ بھی مان لو

یہ اور بات ہے کہ اسے ہم نے طے کیا
آیا تھا راستے میں چڑھاؤ بھی مان لو

ہر بات کا ثبوت نہ مان لگا کرو یہاں
کچھ بے نشان ہوتے ہیں گھاؤ بھی مان لو

وہ تو کھلی کتاب ہے اے کافرانِ خیر
ایمان اک رسول پہ لاؤ بھی مان لو

ہزار تہنیتی ہی ملیں گے یہی ہمارے
مری کتاب پہ دیکھتے تھے بھی ہوتے

خمارِ خواب کے بے خواب تجربے بھی ہوتے
وہ دن بھی کیا تھے ترے نامِ رتبہ کی ہوتے

تمام جھوٹی انا تھی یہی تو اک سچ ہے
ہمیں تو ہوتا تھا رسوا ترے لئے بھی ہوتے

زمین سے ربط مگر ٹوٹ ہی نہیں پاتا
درازا اپنی اڑانوں کے سلسلے بھی ہوتے

ہزار قرب کے پہلو تھے درمیان سے مگر
پہاڑ جیسی روایت کے فاصلے بھی ہوتے

رکے تو باد صبا سے بھی خوف آتا تھا
چلے تو خیر ہواؤں کے سامنے بھی ہوتے

میں خال رخ ہوں حق میں ہے چشم بد کے ساتھ
 یہ صفر بھی شمار میں رکھتا عدد کے ساتھ
 قراءت میں اک جلاں کتابت میں اک جمال
 تو حرفِ خوش نواسے مزہ دے جو مد کے ساتھ
 شربان اور وید کی سمتیں بسدا ہی
 ہے اک دلی لگا وازل کا ابد کے ساتھ
 ہے ایک کھیل آمد و رفتِ خمارِ گلے
 سودا یہ پٹ گیا تو ہے دل کا خرد کے ساتھ
 مخلوطہ بدن ہو کر مکتوبِ دل — نظر
 پڑتی ہے کس خلوص کے کس شد و مد کے ساتھ
 ناشت پر کوئی بار نہ ٹھیری کھلے گمرہ
 دستِ ہنر نہاتا رہا نیکے بد کے ساتھ
 وہ حرفِ ماورائے سخن جاننا نہیں
 مشکل یہ ہے ذائقہ نابلد کے ساتھ
 مسجد نہ نافقاہ کے ہم سے خراب حال
 اٹھیں ادب کے ساتھ جو سٹھیں تو مد کے ساتھ
 تم خیر جو بھی ہو مری پہچان بھی تو ہو
 میں تو بجائے خود ہوں سبب بھی و مد کے ساتھ

دلیزیر کھڑا ہے لہو زنگ آفتاب
کب تک رہو گے یونہی خراب خمار خواب

مائل کبھی حجاب تو خارج کبھی نقاب
وہ کھل نہیں سکے کرہے دنیا بڑی خراب

ہے کس کو ہوش کونسا پل کٹ گیا کہاں
اب عمر رائیگاں کا نہ مانگا کرو حساب

یہ ضد ہوا کو ہے میرا خیمہ اکھاڑے گی
یہ ضد زمین کو مری مٹی نہ ہو خراب

چڑیا درخت پر تو نہیں دبسترس میں ہو
بہتر ہے ہاؤ ہو سے تو اک حرف دستیاب

حرفِ نجات و توبہ سے مشرق کو مار ہے
مغرب سے اور کیا نکل آئے گا آفتاب

اس شہر شور میں ہے غنیمت روفِ خیلو
ایک یا خوش سخن تو کم از کم ہے دستیاب

چھاؤں میں بیٹھے ہوئے جھلسے زیادہ
 مسئلے گھر میں ہیں کابل سے زیادہ
 بوے گل ٹھہری کہاں گل سے زیادہ
 ہم نے جانا ہے تنجاہل سے زیادہ
 یہ حقیقت ہے تخیل سے زیادہ
 حسنِ پتھر میں بھی ہے گل سے زیادہ
 ایک حرفِ نارسا اور کچھ نہیں ہے
 بیچ میں ٹوٹے ہوئے پل سے زیادہ
 راستہ سب کچھ نہیں منزل بھی تو ہے
 جزو میں لذت نہ لے کل سے زیادہ
 اب کھلا ہم پر نہیں ہے مول اپنا
 اک ترے حرفِ تامل سے زیادہ
 کب ہیں سرگرداں بدن کے واسطے ہم
 مل ہی جاتا ہے تو کل سے زیادہ
 اہمیت ہے خیر اندازِ نظر کے
 شعر میں رنگِ قندل سے زیادہ

شہر میں اتنے پیار ہم اپنی کس خوبی سے ہوئے
قابلِ رشک و خوش قامت تیری محبوبی سے ہوئے

یوں تو مسائل سب اپنے طے خوش اسلوبی سے ہوئے
باقی جتنے فتنے تھے سیدھے سرکوبی سے ہوئے

پیر بن یوسف نے کیا راز تمہارا فاش تمام
تم وہ بھائی کہ شرمندہ دیدہ یعقوبی سے ہوئے

خدیو ہی نا آخر مقتول ہی اپنے قاتل تھے
دھتے دامن و بھر سے غائب کس خوبی سے ہوئے

غریب شہر سے اتنے تپاک سے نہ ملو
 جو تم ہوا کا ہو جھونکا تو خاک سے نہ ملو
 ”ہتر ہزار کفِ کوزہ گر سے کھلتے ہیں ہے“
 یہ کیا کہ خاک ہی ٹھیرے تو چاک سے نہ ملو
 ہزار آنکھیں ہیں جیسے لگی ہوئی ہسم پر
 نظر لگے نہ کہیں اسہاک سے نہ ملو
 نہ دشتوں کی خبر ہو نہ دامنوں کی تمہیں
 اگر ہمارے گریباں کے چاک سے نہ ملو
 بری کچھ اتنی بھی آلودگی نہیں ہوتی
 گمانِ پاک لئے مشتِ خاک سے نہ ملو
 بچھڑنے والو جدائی کا حوصلہ ہے میں
 خبر کی طرح کسی روز ڈاک سے نہ ملو
 پتہ نہیں تمہیں کس بات پر ہے ناز اتنا
 ہیں کج کلاہ بڑے ہم بھی ناک سے نہ ملو
 فادِ ذہن و لبِ زہر آشنا لے کر
 روفِ خیر کے شہد اب تاک سے نہ ملو

کیسا پہلے گھریں ذرا شور دیکھنا
فرست سے پھر کراچی و لاہور دیکھنا

دیتا نہیں ہے زیب کسی اور دیکھنا
جہدِ مسلسل لگس و مور دیکھنا

پہلے خود اپنی آنکھ کا تنکا تو دور کر
پھر دستِ خوش حنا میں کوئی چور دیکھنا

آخر یہ کسی خاک سی اڑتی ہے چار سو،
بادِ شمال کیوں ہوئی متہ زور دیکھنا

دیوار ڈھائے گی کہ کوئی فصل لائے گی
ہر سو گھٹا تو چھائی ہے گھنگھور دیکھنا

اپنے پردوں میں مست ہے پیروں کو بھول کر
رفقہاں ہے کس مزے سے ابھی مور دیکھنا

دیکھو نہ یو بھنودوں میں گرہ ڈال کے مجھے
ٹوٹے نہ درمیاں سے کہیں ڈور دیکھنا

میرے مذاقِ حسن میں شامل ہے عشق بھی
ہر طرح سوچ لو تو مری اور دیکھنا

یارانِ بدگمیاں کو یہ حسرت ہی رہ گئی
مجھ کو اسیرِ لمحہ کمزور دیکھنا

ہم جانتے ہیں خلیں یہ کس کی آنکھ ہے
یہ اور دیکھنا نہ ترا چھور دیکھنا



میں زندگی کا ایک دہکتا الاؤ ہوں
گھڑیادہ موم کی مرے پاس آنے سے رہی

پھولوں کی بیل ہے کہ بھرم کی نقاب سے
بیرونِ بام و در ابھی گھاس آنے سے رہی

بڑے بڑوں نے لکھا ہے ہی قصیدہ تو
اٹھاؤ آنکھ پڑھو حسن کا صحیفہ تو

لجیب مٹھی کسک ہے روئیں روئیں میں رواں
متاعِ جاں ہے دھڑکتا ہوا کلیجہ دستو

لبِ نشاط سے پھوٹا ہے زم زم شہد آب
حصارِ جسم سے باہر نہیں ہے کعبہ تو

نہ پھول آئینہ دارِ بدن نہ رنگِ شفق
حصنِ حسن ہے پھیکا ہر استعارہ تو

یہ تھر تھراتے ہوئے لب یہ سرسرا تا بدن
تمہارے نام معنوں ہیں من و سلویٰ تو

یہ کھلکھلاتا ہوا چہرہ، بولتی آنکھیں
وہ خود کو یاد نہ رکھے تمہیں جو دیکھتا تو

نشہ ما آتنا ہے اک تم کو دیکھ لینے سے
نشاطِ حرف و صدا تم سے بات کرتا تو

یونہی نہیں ہوئے کچھ ہم تمہارے گرویدہ
خرید لیتا ہے ہم کو تمہارا ہجہ تو

یہ واقعہ ہے ستارے سے تم نہیں منسوب
تمہارے نام سے منسوب ہے ستارہ تو

چلے ہی آتے ہیں تشنہ دہان خوش نظری
تمہاری ذات میں سمٹا ہوا آئینہ دریا تو

ہجومِ جلوہ سے خلوت میں ٹوٹتا ہے بدن
نیا ہے ذوقِ نظارہ ذرا سنبھلتا تو

دصالِ یار سے بڑھ کر نہیں کوئی غستا
رؤفِ خیر نے فی الحال اتنا جانا تو

دامن نہ پیساریں یہ ارادہ بھی رہا ہے
 کیا لینا جو وہ ہاتھ کشادہ بھی رہا ہے
 اندازہ طرفِ صفِ اعداء بھی رہا ہے
 شبِ خون کا امکان زیادہ بھی رہا ہے
 ہیں مارے ہوئے ہم تو تری خوش بدنی کے
 ناکام ہی کچھ تیرا بادہ بھی رہا ہے
 لکھ لکھ کے کئی نام مٹانے بھی پڑے ہیں
 یہ دل کہ بہت صفحہ سادہ بھی رہا ہے
 ہر فلسفہ ٹھہر ہوا حرفِ مکرر
 اس طرح ترا ذکر زیادہ بھی رہا ہے
 کس شخص کے ہاتھوں میں بھٹاتے ہو بیالہ
 دیکھو تو وہ شائستہ ببادہ بھی رہا ہے
 دراصل کبھی مات نہ کھانے کا ہنر سیکھ
 فرزین کے مقابل تو پیادہ بھی رہا ہے
 کس کو چہ سربستہ میں جیراں ہو نہ بھول
 اک شخص سے لوٹ آنے کا وعدہ بھی رہا ہے
 ہم خیر اسی ضد میں تو آگے نکل آئے
 سنتے تھے کہ مشکل ترا جادہ بھی رہا ہے

نہ میں عرب ہوں نہ دنیا عجم ہے میرے لئے
مری خموشی ہی گویا بھرم ہے میرے لئے

نمو کا جوش سلامت میں بے نشان تہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک خم ہے میرے لئے

کوئی خمار ہو یا بت ہو ٹوٹ جاتا ہے
عجیب مرحلہ کیف و کم ہے میرے لئے

یہی نظر تو کہیں ٹھہرنے نہیں دیتی
ترے لئے جو خدا ہے صنم ہے میرے لئے

نہ اپنی فکر ہی مجھ کو رہی نہ دنیا کی
ترا خیال بڑا خوش قدم ہے میرے لئے

اے قریب سے دیکھو تو جانے کیا نکلے
وہ شخص خیر ابھی محترم ہے میرے لئے

وہ وحشی ہم ہیں کریوں بھی کسی کے بس کے نہیں
 شروع ہی سے جو عادی کسی قفس کے نہیں
 حرارتوں کا بھی اندازہ کر چھلس کے نہیں
 کہ زندگی کے تقاضے کوئی ہوس کے نہیں
 سہل ہے کیا کیا نہ اب تک بھی ہم نے ہنس کے نہیں
 تمہیں کہو کہ یہ حالات کس برس کے نہیں
 اسی خیال سے پھر آنکھ لگ گئی شاید
 ہمارا نام لبوں پر ابھی جبرس کے نہیں
 ہمیں نے کچھ نظر اندازیوں کی حد کر دی
 بُرا نہ مان کہ یہ گھاؤ تیرے بس کے نہیں
 حیاتِ جبر سے اے دوست موت بہتر ہے
 گزار زندگی لیکن ترس ترس کے نہیں
 نکل پڑے ہیں ہوا میں چراغِ جاں لے کر
 ہم ابتداء ہی سے انسان پیش بس کے نہیں
 ہمیں کس لئے چنگاریاں اُلجھتی ہیں سے
 ہم آدمی ہیں مگر خیرِ خاویں کے نہیں

مقتل سجے ہیں کوچہ و بازار کی طسرح
ہر شہر میں فساد ہے تہوار کی طسرح

پوچھے نہ جاؤ گے کسی اوتار کی طسرح
بہتر یہی ہے جی لو گنہگار کی طسرح

ہے بادِ تند سر کو ٹپک کر لہو لہان
جانِ حزیں ہے راہ میں دیوار کی طسرح

یہ سوچتا کھڑا ہوں سرِ راہِ پیش و پس
کیسے نباہوں تم سے ریاکار کی طسرح

چہرہ بدل بدل کے جو آتا ہے سامنے
ہر شخص جی رہا ہے اداکار کی طسرح

میں ہوں ازل سے راہِ در راہِ منحنی
رستے میں پل صراط ہے تلوار کی طسرح

کسی کے سنگِ ملامت سے اور حسد سے بچاؤ
مجھے جنوں سے بچاؤ مجھے حسد سے بچاؤ

میں ابرہوں مجھے یوں بھی کہیں برسنا ہے
مگر خدا کے لئے دشتِ نابلد سے بچاؤ

میں بے لباس ہوں اب آکے شکستہ دیوار
مجھے ملامتِ شہرِ دراز قد سے بچاؤ

میں اک جزیرہ ہوں تم مانتا بکامل ہو
گھرا ہوا ہوں سمندر کے جزر و مد سے بچاؤ

یہاں تو جو بھی ہے بھٹکا ہوا ہی لگتا ہے
کہوں میں کس سے مجھے راہِ مسترد سے بچاؤ

مراد جو دمرے دور کا تقاضہ ہے
مجھے خدا کے لئے قاتلوں کی زد سے بچاؤ

کہا کرو نہ لہو صرف کر کے خیرِ غزل !
خدا کے واسطے خود کو نگاہِ بد سے بچاؤ

آپ اپنے سے دوستی قبلہ بند آگے ہے یہ گلی قبلہ
 غام پرداز و رنگِ خام کا نام ایک تتلی نچی کھچی قبلہ
 کب کبوتر کو اس آتی ہے ان عقابوں کی دوستی قبلہ
 میرے اندر بھی بھڑیا ہے کوئی ہے اگر تم میں لومڑی قبلہ
 دھیر دھیرے مگر بیا کی طرح گھرباتی ہے بدظنی قبلہ
 آخرش دھوپ سو گئی تھک کر شام تک ساتھ ساتھ تھی قبلہ
 زندگی دلفریب گڑیا ہے وہ بھی بارود کی بنی قبلہ
 راکھ میں ڈھونڈتی ہے چنگاری کیا غضب ہے یہ آس بھی قبلہ
 اپنے ہونے کا کچھ یقین آئے خط تو لکھتے کبھی کبھی قبلہ
 کوچہ فن میں ہو نہیں سکتا کوئی فنکار آخری قبلہ
 خیبر درسِ عروض دیتے ہیں حرکے بے بحر شاعری قبلہ

اڑتے تھے آسماں میں کبوتر یہاں وہاں
بے پر پڑے ہیں اب وہ زمیں پر یہاں وہاں

موسم بڑا سہانا ہے باہر یہاں وہاں
کیسی شکست دیکھتے ہیں اندر یہاں وہاں

کوئی اثر رُتوں کا بدن پر نہیں رہا
کیا دیکھتے ہو اب اسے چھو کر یہاں وہاں

دستِ ہوا میں آنے کا دامن چرغ
دیکھتا ہزار بار الجھ کر یہاں وہاں

سورج تیریدِ وقت کی صورت نکل پڑا
بکھرے پڑے ہیں خواب بہتر یہاں وہاں

یوں ہی راز و نیازِ نامعلوم کب تک اے دلنوازِ نامعلوم
 یوں کبوتر کھلے نہ چھوڑ اپنے ان پہ جھپٹے گا بازِ نامعلوم
 فیصلے ڈھل گئے فسانوں میں تب کھلا سازِ بازِ نامعلوم
 خاکساروں سے بھی ملا کیجئے جائیے تافزارِ نامعلوم
 آنکھ میں بالِ پُر گیا جیسے ساتھ ہے حرصِ دآزِ نامعلوم
 میں بڑا سخت جان ہوں، تیرا درد ہے یا گدازِ نامعلوم
 بدگمانی بڑی بُری شے ہے کھولتی ہے محاذِ نامعلوم ۱
 کون جانے اے کہاں چھوڑا لے اڑا تھا جہازِ نامعلوم
 ٹوٹے پھوٹے نہیں دیتا جذبہٴ ارتکازِ نامعلوم
 میرے بارے میں گھڑ گیا کیا کیا اک فسانہ طرازِ نامعلوم
 خیر کرنے ہمیں نہیں دیتا ایک دستِ درازِ نامعلوم ۲
 ۱۔ صوتی قافیہ

لُٹنے کا شوق کب تھا جو سچ درجہ کے شہر میں
 لوگ آگئے تھے کھاؤں سے سب تج کے شہر میں
 انہونی تھی جو ہو کے رہی دکھ ہی تو ہے
 کیا سائرن تھے رہ گئے سچ تج کے شہر میں
 یونے خور اپنے سایوں سے خوش ہم سے ہیں خفا
 اندھیر کس قدر ہے یہ سورت کے شہر میں
 اس جنگ میں تو دستِ اماں بھی شریک ہے
 اک بے کلی کا راج ہے دھیرج کے شہر میں
 مہنگا پڑے گا میرا ہو سوج لہجے
 میں سخت جاں ہوں قتلِ مرقح کے شہر میں
 پائے ثبات ہوں میں ہر اک پل صراط پر
 دستِ دراز ہوں کلمہ کج کے شہر میں
 انصاف کی جو پوچھو تو کہہ دوں خطا معاف
 احساسِ مجرمانہ ہے ہرنج کے شہر میں
 ہمراہ جبریل و ابابیل بھی نہیں
 بھبھا گیا ہوں اوس کے خنزرج کے شہر میں
 میں خطِ خیالِ اسود و ابیض کے درمیاں
 حرفِ صحیح - لہجہ کج کے شہر میں

کہ سحرِ سامری وقتِ چل نہ پائے گا
 یہ سانپ میرے عصا کو نکل نہ پائے گا
 جو حرفِ حرف کھلونوں میں ڈھل نہ پائے گا
 نحسی کتاب سے بچہ بہل نہ پائے گا
 وہ میرا دوست سنہی جھول جھول ہے آخر
 اُسے سنبھالنے والا سنبھل نہ پائے گا
 مرا حیراغ تو آندھی میں بھی سلامت ہے
 انھیں گمان ہی تھا کہ چل نہ پائے گا
 چلا ہے لے کے کہاں یہ شرارِ بوہمی
 کہ برفِ زار میں یہ بیج پھل نہ پائے گا
 اُنا کے ریشمی تاروں سمیت اُبال اُسے
 وہ اپنے غول سے باہر نکل نہ پائے گا
 ہمیں تلاشِ کتابوں میں اور سینوں میں
 مشاعروں میں ہماری غزل نہ پائے گا
 زمانے بدلیں گے موسم بھی فلسفے بھی مگر
 یہ حرفِ خیر کا سکہ بدل نہ پائے گا

کیسی ہوا بدل کے اچانک ہی رہ گئی
 سر کھو گیا کلاہ مبارک ہی رہ گئی
 مانگی جو آفتاب سے پہچان کی دلیل
 محراب ہر چراغ میں کالک ہی رہ گئی
 کیا کیا سکون لذت لا علمیت سے تھا
 خود آگہی کہ جان کی گاہک ہی رہ گئی
 تھا شانت بھی اشانت بھی ساگر سا وہ بدن
 یادش بخیر سینے میں ٹھنڈک ہی رہ گئی
 ٹھہرا ہر ایک جرعت نہ ہر سب رائیگاں
 بے انت پیاس تو مرا مسلک ہی رہ گئی
 بین السطور تم نے پڑھا بھی نہیں مجھے
 تم سے جو بات کہتی تھی گنجلک ہی رہ گئی
 شاید اب اس مکان میں رہتا نہیں کوئی
 پاگل بنی ہوئی مری دستک ہی رہ گئی
 گل وہ ہنر چراغ گجہ دم تو ہو گیا
 تحسین ناشناس کی کالک ہی رہ گئی
 تھے سو چراغ ایک سیاہی کی بوندیں
 ممنوع ہو کے خیر وہ کستک ہی رہ گئی

اگر یہ سچ ہے کہ سچائیاں نہیں بکتیں
مری دوکان پہ بیساکھیاں نہیں بکتیں

گھروں سے کٹ گئے کچھ بھائی راستوں میں کٹے
سواہتمام سے اب رانکھیاں نہیں بکتیں

سروں کو مفت ہی ملتی ہیں گولیاں کیا کیا
سڑک پہ دیکھو تو ترکاریاں نہیں بکتیں

حروف سیکھ کہ ہر در پہ قفل ابجد ہے
رہے خیال کہیں چابیاں نہیں بکتیں

یہ منتظر ہیں کنویں پر کلیم ہی کیلئے
خطا معاف کبھی لڑکیاں نہیں بکتیں

خرید لیتے ہیں دنیا خریدنے والے
یہ تم سے کس نے کہا وریاں نہیں بکتیں

وہ ہو چسپم راون کہ جنت آدم
بدست سرو کہیں گر میاں نہیں بکتیں

یہاں تو باتہ مسلم کر دیئے گئے ہیں کئی
سو اس نگر میں کہیں تختیاں نہیں بکتیں

یہ مال مفت نہ اور دوستوں سے ملے
کہیں غم پر پیر کا لیاں نہیں بکتیں



بس تجھے دیکھتے رہنے کی قسم کھائی ہے
اور کیا اس کے سوا مصرفِ بینائی ہے

وہ مرا حق سکونت نہیں دیتا مجھ کو
اور اس پر بھی یہ دعویٰ ہے مرا بھائی ہے

آسماں کے نہ ہوئے اور زمیں کے نہ رہے
آج ہم تجھ سے بچھڑ کر تو کہیں کے نہ رہے

کون کہتا ہے کہ اصحابِ میں کے نہ رہے
ہم وہ ٹھہریں جو کبھی شمرِ لعین کے نہ رہے

آسمانوں کی بلندی پہ نظر ہے اس کی
اب وہ اندازِ ترسے خاکِ نشیں کے نہ رہے

لوگ کیا سادہ ہیں ہر بت کو خدا کہتے ہیں
یہ تقاضے ہی کبھی اپنی جہیں کے نہ رہے

نام لکھتے ہیں فقط پرکھوں کی دیواروں پر
خوش گماں ہیں وہ کچھ اتنے کہ لقیں کے نہ رہے

خیر وہ چہرے نقابیں ہیں انا کی جن پر
آئینے کے نہ رہے آئینہ بیں کے نہ رہے

جو ہو جہاں تر بھی زد میں تو ڈھیر ہوتا ہے
فضا میں ایک پرندہ بھی شیر ہوتا ہے

اُدھر ہے ہر اُدھر تا بکا راک ذرہ
جسے زوال نہیں تھا وہ زیر ہوتا ہے

ہمارے دل میں اترتی نہیں دماغ کی بات
کہ یا راس میں بڑا ہیر پھیر ہوتا ہے

تمام دشت و جبل ریت کے گھر فندے ہیں
تمہارا چاہنے والا دلیر ہوتا ہے

اب آزما بھی تماشے سے آخری اپنے
یہ سیر چشم کہاں ایسے سیر ہوتا ہے

خطا معاف کہ مشکل یہی ہے خیر کے ساتھ
یہ سرفراز ہی اکثر بدیر ہوتا ہے

سچی نہ اچھن خود ستائیاں اب کے
کتاب کی نہ ہوئیں روٹائیاں اب کے

پہنچ گئی ہیں وہاں نارسائیاں اب کے
یہ ڈر ہے پاٹ سکیں گے دکھائیاں اب کے

جگہ جگہ تو ہوتی وہ لڑائیاں اب کے
دوبانی دیتی ہیں سوئی کلائییاں اب کے

سفید آنکھ میں سارے سیاہ منظر ہیں
عذاب ہو گئیں کیا کیا ترائیاں اب کے

نظر پہ کھل گئیں عریائیاں تمام اس کی
بچا سکیں نہ اسے خوش نمائیاں اب کے

ہماری خاک سے نکلیں نشانیاں کیا کیا
کہ رائیگاں نہ گئیں کچھ کھدائیاں اب کے

یہ فاصلے کوئی دشوار استقدر تو نہ تھے
پہاڑ بن گئیں بے نام رائیاں اب کے

نہ جانے کس کی دعا کام آگئی ورنہ
ہماری جان ہی لیتیں دوائیاں اب کے

وہ ہم سے خاک نشینوں کا ہم نشیں نکلا
تو سرفراز ہوئی ہیں چٹائیاں اب کے

ہمارا بھائی بھی سمجھا نہیں ہیں بھائی
سودل دکھا تو دکھا انتہائی یاں اب کے

کچل گیا ہے سر راہ نوجوان کوئی
کہ لٹ گئی ہیں کسی کی کمائیاں اب کے

روں خائیں نے چپ سادھ لی ہے کسی
کہ کھل رہی ہیں بہت بے نوائیاں اب کے

بجتی نہیں فقیر کی جھولی ہی کیوں نہ ہو
 چاہے رئیسِ شہر کی بولی ہی کیوں نہ ہو
 احسانِ رنگِ غیر اٹھاتے نہیں کبھی
 اپنے لہو سے کھیل وہ بولی ہی کیوں نہ ہو
 سچ تو یہ ہے کہ ہاتھ نہ آنا کمال ہے
 دنیا سے کھیل آنکھ مجھ بولی ہی کیوں نہ ہو
 ہے آسماں وسیع، زمیں تنگ ہی کبھی
 تعمیر کر کہیں کوئی کھولی ہی کیوں نہ ہو
 حق پر جو ہے وہی سرو شانہ بلند ہے
 ہے در نہ بے بساط وہ بولی ہی کیوں نہ ہو
 دریا کی کیا بساط کہ مجھ کو ڈبو سکے
 محنتی کہیں کہیں مری ڈولی ہی کیوں نہ ہو
 تلخی میں بھی مزہ ہے جو تو خوش مذاق ہے
 پک جائے تو بھلی ہے مٹی بولی ہی کیوں نہ ہو
 کچھ تو مددِ شاخِ خیر سمجھنے کے کرتی
 ہر چند بے مزہ مری بولی ہی کیوں نہ ہو

یہ مسئلہ تو حل بخدا کب کا ہو گیا
 جو باغ وقف ہو گیا وہ سب کا ہو گیا
 کمرے لگا ہے چاند ستاروں پہ لعن طعن
 یہ حوصلہ بھی ماتمی شب کا ہو گیا
 کب تک رہے گا بند یونہی خول سے نکل
 بوسیدہ یہ مکان جد و آب کا ہو گیا
 سے کوئی خوش گمان تو کوئی ہے بد گمان
 کیا کمال حرف مذہب کا ہو گیا
 کمرے لگا ہے ٹائی لگی ہم سے گفتگو
 وہ شخص جب سچہ مہذب کا ہو گیا
 اللہ کی پناہ بھرتی نہیں نگاہ
 یہ شام کا راب مرے مطلب کا ہو گیا
 بلغار قلب پر ہے مین و سار کی
 ہر شخص کو جنون سا مذہب کا ہو گیا
 سار سخن دھڑکے دھڑکے گئے وہاں
 میں تو روف خیر مخاطب کا ہو گیا

وہ خوش سخن تو کسی بیروی سے خوش نہ ہوا
 مزاج لکھنوی ودہوی سے خوش نہ ہوا
 ملال یہ ہے کہ آخر پھر گپا جھڑ سے
 وہ ہم سفر و مری خوش روی سے خوش نہ ہوا
 تجھے خبر بھی ہے کیا کیا خیال آتا ہے
 کہ جی ترے سخن ملتوی سے خوش نہ ہوا
 فقیر شاہ نہیں شاہ ساز ہوتا ہے
 یہ خوش نظر نگہ خسروی سے خوش نہ ہوا
 سچے ہوئے ہیں ابھی دل میں خوابِ بستان
 یہ سومات کچھ غزنوی سے خوش نہ ہوا
 وہ آدمی ہے جوابِ حیات کا پیاسا
 شرابِ عیسوی و موسوی سے خوش نہ ہوا
 وہ کم سخن تو مراد شمن سخن نکلا
 غزل سے خوش نہ ہوا ملتوی سے خوش نہ ہوا
 اسی کو آیا سر آنکھوں پہ بیٹھنے کا ہنر
 جوانی حیثیتِ ثانوی سے خوش نہ ہوا
 روفِ خاں بھلا تم سے کیسے خوش ہوگا
 وہ مولوی جو کسی مولوی سے خوش نہ ہوا

دو چار ہے نئی آنکھیں سے آج دیوانہ
نہ شہر شہر ہے ویرانہ ہے نہ ویرانہ

پیمبروں کو بھی ہجرت پہ کر گئی مجبور
پلٹ کے آئے تو خاک وطن نے پہچانا

بشروروں کے انگوٹھے تراش ٹٹلے میں
نواز شوں پہ جب آیا مزاجِ شاہانہ

حربِ سامنے بھل کر کعبی نہیں آتا
رکھیں تو کس سے رکھیں چشمِ حریفانہ

نظر میں پھرتی ہے شاذ و اریب کی صورت
ہمارے ہاتھ سے اٹھتا نہیں بے پیمانہ

رؤفِ خیر اگر ہے سخن کا چسکا ہی
نکالے کوئی انداز بھی جس کا گانہ

تا جکے منزل بمنزل ہم مسافر بھاگتے
آنکھ اب ٹھہری ہوئی ہے اور مناظر بھاگتے

اے حریف ہر قدم شہ مات سے بچنے کی سچ
اس بساطِ خاک سے کیا ہم سے شاطر بھاگتے

ہم تو آتے ہیں یہاں مٹنے مٹانے کے لئے
اس زمینِ کربلا سے کس کی خاطر بھاگتے

بس میں آجانے کا جذبہ بس میں کرنے کی ہوس
خاک و باد و آب و آتش بھی ہیں قاصر بھاگتے

سر کہیں پاؤں کہیں آنکھیں کہیں چہرہ کہیں
اس ہوس میں کھو گئی پہچان آخر بھاگتے

خیر شب خوں مار کر چھپ جانے والے ہم نہیں
معرکہ سر کرنے نکلے ہیں تو کیا پھر بھاگتے

کھود لیتے ہیں کنواں شہد اب پالتے ہیں خیر
اس زمینِ سخت سے کیا ہم سے شاعر بھاگتے

گمزر رفتے کرت نے ہمارا خیال رکھا ہے
 کہ بوئے خوش خبری سے نہال رکھا ہے
 ہمارا ہاتھ ابھی نا آگہی کے ہاتھ میں ہے
 اس آگہی نے ہمارا خیال رکھا ہے
 ہمیں یہ بھول بھلیاں ڈرانہ پائیں گے
 ہتھیلیوں میں لکیروں کا جال رکھا ہے
 لہو ہے گرم تو میدان کارزار میں آ
 یہ کیا کہ خیمہ خالی سنبھال رکھا ہے
 نموجو ہے تو سر شاخ زہریر بھی کھل
 مجھے ہوانے بہت پائمال رکھا ہے
 سماعتوں میں مری حرف جم گئے اُسکے
 یہی تو کان میں مال و منال رکھا ہے
 وہ میرا بھائی ہے کیا میں بھی اُسکا بھائی ہوں؟
 اسی سوال نے الجھن میں ڈال رکھا ہے
 نکل ہی آئے گا میرا ستارہ سحری
 سوادِ شب نے کسے یرغمال رکھا ہے
 یہ حرفِ خیر کوئی دفتر سیاہ سہی
 سخن کے چہرے پہ تل کی مثال رکھا ہے



ایسا بھی نہیں صرف سر جانے کے لئے ہے
یہ بات تو عبادو بھی جگانے کے لئے ہے

افسوس کہ ہم خلیق مہر مند نہیں ہیں
ہر ہر تو تریاق بنانے کے لئے ہے



ہر چہ کچھ علاقہ نہیں شدہ کے ساتھ
عبدالرؤف خیر کا عبدالصمد کے ساتھ



خوشک لمحوں کے میں ملے ہوتے ہم لوگ ہمیں
رات بھیکے تو ضروری تو نہیں سو جانا



دل دکھ نہ جانے بات کتنی بے سبب نہ پوچھ
خانہ بدوش لوگوں سے نام و نسب نہ پوچھ

وہ آگیا ہے تو اب یہ سوال ٹھیک ہے
اسے خبر نہ ہو گھر کا جو حال ٹھیک ہے



اے وہ خوش فہمی سے دامن کو جھٹکنے والے
والہانہ ترے دامن سے لپٹنا کب ہوں

دائرہ بنتا ہوا نقطہ آسمانوں میں
خیموں کی پوری آنکھوں میں سمٹنا کب ہوں



ہم کو یہ ضد کہ وہیں پاؤں جھسائیں اپنے
جس جگہ کافی بہت اور تماشائی بہت



ہم لیے پھرتے ہیں پہچان ہنرمندی کی
شہر میں نام ہمارا اب وجد سے کب تھا



*

ہمارے قامتِ زیباً پہ حرف رکھتے ہیں
وہ جن کی عمر کٹی آئینے سے ڈرتے ہوئے

بلا سے پیچ بنو حرف زیر لب نہ بنو
کوئی نشان تو چھوڑو کہیں سے گزرتے ہوئے

*

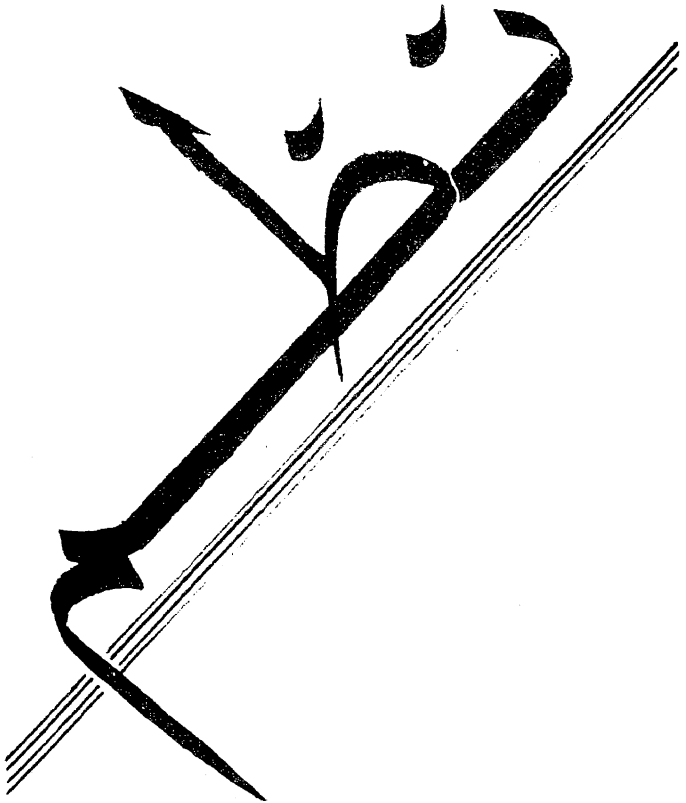
جی رہا ہوں مری بات ادھوری ہے ابھی
ایک بے انت کہانی کی پنا ہے، میں ہوں

زندگی زہر ترا کام نہ کر پائے گا
جس بیتسمہ زہر اب لیا ہے، میں ہوں

*

میں کسے ناراض کس کو خوش کروں
موم کا پُستلا ہوں انگاروں کے بیچ

میں اُسی سکے میں لوٹاتا بھی ہوں
آئینہ ہوں آئینہ داروں کے بیچ



نمؤ کا جو ش سلامت میں بے نشان نہیں
کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لیے

بَیِّنُ السُّطُورُ

ابھی ہے زمیۃٴ اول پہ آفتاب بُہر
میں چل رہا ہوں ادھورا مگر ہے میرا سفر
ہزار سال بجھے ہیں زمیں کے سینے پر

جگہ جگہ ہیں کہیں گاہیں آسمان میں بھی
عجیب طرح کی لذت ہے امتحان میں بھی
بلا کا جوش بڑا حسن ہے اڑان میں بھی

میں اڑ رہا ہوں کہ پرواز ناممکن ہے
نبیاز ادھورا ہے اور ناز ناممکن ہے
بہنچ نہ پائے تو آواز ناممکن ہے

بڑی طویل عبارت ضرور ہوتی ہے
جو بات ہوتی ہے بین السطور ہوتی ہے

امانت — — آنے والی ساعتوں کی

ایک پرچھائیں سی ابھری تھی
 سرِ غارِ حرائے جہاں
 کہ جس نے غہرِ حیلِ لفظ کا ادراک بخشا
 عطا کی سارے دہرائے ہوئے لہجوں سے توفیقِ بجاوت
 مرے سینے کو چیرا
 اپنی بے جسم انگلیوں سے اس میں کوئی چیز رکھ دی
 بڑے فرسودہ ذہنوں میں مجھے مبعوث کر کے
 امانت سونپ دی سب آنے والی ساعتوں کی
 خود کہیں گم ہو گئی

شاینگ

بے شک تھی شاہکار۔ گلہری میں گھاس تھی
گھڑیا نہ لی کہ وہ تو فقط خوش لباس تھی
تصویر بولتی سہی، تصویر ہی تو تھی

چینی کا تاج خوب تھا، ناپایدار تھا
تھا بادشاہ وقت مگر باقی دانت کا
ایسا کھٹکنا تھا جسم تھا جو ٹوٹا رہا

بازار کا جو مال تھا جی کو نہیں لگا
کچھ دیر اور جیب میں سکے پڑا رہا

پھر یوں ہوا کہ خریدنے سے گھر لوٹے ہوئے
آنکھیں خریدیں کسی اندھے فقیر سے

وصیت

یہ واقعہ ہے کہ میں ابن بے اثاثہ ہوں
 تمام روئے زمین جائیداد ہے میری
 یہ جائیداد نہایت حقیر ہے پھر بھی
 یہ جائیداد ترے نام ہے مرے بیٹے

یہ مشورہ بھی ہے میرا قبول کر لینا
 ہمارا باپ نکالا گیا تھا جس گھر سے
 میں نکلا گیا ہوں اسی جائیداد کی خاطر
 وہ گھر کہ جس کی کوئی تولیت نہیں ہوتی
 وہ گھر کہ جو کبھی ملت انہیں وراثت میں
 وہ جسم و جاں کے عوض بھی ملے تو لے لینا

ویڈیو گھر

(VIDEO GHAR)

دائیں بائیں آگے پیچھے
 کھیرے ہی کھیرے کیسٹ ہی کیسٹ
 اک ذرا ہلچل ہوئی اور کھیرے چلنے لگے
 اک ذرا آہٹ ہوئی، محفوظ ہو کر رہ گئی
 کھیرے کی آنکھ سے بچنا کہاں آسان ہے
 ہاتھ کی دانتگی محفوظ ہے
 بے خودی پابستگی محفوظ ہے
 آنکھ کی شائستگی محفوظ ہے
 سانس کی وابستگی محفوظ ہے
 گوش بر آواز دہ کیسٹ بھی ہیں جو
 کھیروں میں نصب ہیں

کھیرے میں دن کی اک اک بات ہے
 کھیرے کی زد میں ہر اک رات ہے
 کھیرے میں پاؤں کی ہر درج بھی محفوظ ہے
 دردِ دل محفوظ بلکہ سوچ بھی محفوظ ہے
 ہاں ہوا میں ہاتھ لہراؤ مگر دوسرے کی ناک زخمی مت کرو
 اس زمیں پر پاؤں پھیلاؤ مگر پاؤں پر پاؤں کسی کے مت دھرو

شور کرنے کا متمہیں حق ہے مگر
 دوسروں کو نیند کا حق بھی تو دو
 آن ہوتے ہی نہیں یہ کیمرے
 آن رہتے ہیں یہ کیسٹ ہر گھڑی
 بھاگ کر ان سے کہاں تک جاؤ گے
 کیمرے میں دن کی اک بات ہے
 کیمرے کی زد میں ہر اک رات ہے
 ری پلے دیکھو

مگر جانے کی اب کوئی بھی گنجائش

کوئی صورت نہیں ہے

کیمرے کی آنکھ کیسٹ کا شکم
 شاہد و مشہود اپنے محترم
 ہاتھ پاؤں آنکھ پشانی لب و خاں
 سارے جسم میں ہیں کیمرے ہی کیمرے
 کیسٹ ہی کیسٹ

تم بجائے خود ہی ہو اک ویڈیو گھر
 دیکھنا کس کس کو جھٹلاتے رہو گے
 کیمرے کی آنکھ سے دامن بچانا ہے محال
 ری پلے کو دھیان میں رکھ کر رہنا کرتے رہو
 اپنا حصہ حسن و خوبی سے ادا کرتے رہو

صبحِ کاؤب

یہ سچ ہے جھوٹی حکایتیں من گھڑت لطیفے سنانے والے نے یہ کہا تھا
 کہ لومڑی باز کی بہن ہے
 جو شاخِ زیتون شوق سے نوش کر رہی ہے
 تمام نابستہ شیر سرکس کے اپنے پنچروں میں جا چکے ہیں
 جنابِ دجال ایک ہسڈی کے روپ میں
 گاہِ مشرق میں گاہِ مغرب میں جلوہ فرما ہیں
 اوس و تیز رنج میں پھر لڑائی ٹھنی ہوئی ہے
 فرات گنگا میں مل رہا ہے
 نشان ہر شہر ہے فلسطین بے نشان کا
 گمان کیا کیا ہے بد گمان کا

پھر اس روایت کے بعد راوی نے یہ بھی چپکے سے کہہ دیا تھا
 کہ ذکر اس کا کہیں نہ کرنا
 یہ جھوٹ ہے سب یقین نہ کرنا
 اور اس قدر زور کا قبضہ پڑا تھا
 جو دیدہ تر میں آ کے ٹوٹا
 یہ سچ ہے

دُور درشن

سمٹ کے آگئی دنیا تو چند انجوں میں
 ہجوم رنگ و صدا ہے غریب خانے پر
 میں دیکھتا رہوں کب تک یہ آنکھ واکر کے
 مکاں کی قید تو الزام ہے زمانے پر
 یہاں تو فرصتِ نظارگی کا ماتم ہے

ہٹاؤٹی وی کہ کمرہ مرا کُشادہ ہو
 ہٹاؤٹی وی کہ میں بند آنکھ سے دیکھوں
 وہ سین ابھی جو کسی کیمرے کی زد میں نہیں
 کمال وہ جو ابھی چینلوں کی حد میں نہیں

فالو آن

FOLLOW ON

وہ ہوتی روایتی ————— اکثر
 ساس کی جوتیاں بھی کھاتی تھی
 جھڑکیاں بھی خسر کی سہتی تھی
 اور شوہر سے کچھ نہ کہتی تھی

جبکہ اب ساس بن چکی ہے وہ
 صبح اٹھ کر نماز پڑھتی ہے
 گھڑ کے سب کام کاج کرتی ہے
 چاروں ایکے بہو کے ہاتھ میں ہیں
 اور بیٹا ہے تاش کے گھر میں

خط

میں اس کے نام
سیر پانیوں میں
ایک کاغذی شے
بہا کے دیکھ رہا ہوں
ہوا کا رخ کیا ہے؟

اک نام

تمہارے سامنے کاغذ پڑا تھا
پتھر کھلا تھا
بے خیالی میں نہ جانے تم نے کیا کچھ
لکھ دیا تھا

ریگاب

سمندر کے اس پار ریگاب تو ہے
مگر یہ بھی سچ ہے
نموا ہی نموا ہے
میں بنجر زمینوں میں کیا بورہا ہوں
یہاں واقعی رائیگاں ہو رہا ہوں

اکویریم

AQUARIUM

ایک اکویریم میں بہت پیاری مچھلی تھی
 پھر جانے کیا ہو گیا
 کیا دھکا لگا
 مگر کے ٹوٹا وہ اکویریم۔ پانی سب بہ گیا
 قبل اس کے کہ وہ آخری سانس لے
 میں نے اپنی مچھلی میں تھوڑا سا پانی لئے
 آخری سانس لیتی ہوئی خوبصورت سی مچھلی کو
 جینے کا اک حوصلہ تو دیا
 پھر تو سچ مچ ہی وہ جی اٹھی
 گھس کے کونے میں چھوٹا سا جوحوض تھا
 اس کے حق میں سمندر تھا

پھر یوں ہوا — حوض کا پانی گد لا گیا
 میں نے سوچا کہ اس خوب صورت سی مچھلی کو
 بے حوض کرنے سے بہتر یہی ہے کہ
 تالاب میں چھوڑ دوں
 وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی
 اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لئے
 اس کی آنکھوں کی ہر التجا سے گزرتا گیا

اور بھریوں ہوا
گھر کے پیچھے تالاب تھا
اس کا پانی بھی سب سڑ گیا
اور پھر اس سے پہلے کہ وہ خوبصورت سی مچھلی
کہیں آنکھوں سے نہ دیکھی ہو
میں نے اسکو سمندر حوالے کیا
وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لئے
اس کی ہر التجا سے گزرتا گیا

کل اپنا تک ملاقات ہونے پہ مچھلی نے مجھ سے کہا
اس سمندر سے بہتر وہ اکویریم تھا
جہاں کم سے کم میری پہچان قائم تھی
پھر وہ صدف جیسی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہ گئی
اور میں اپنی آنکھوں میں موتی لئے
اس کی آنکھوں سے نظریں چراتا ہوا
ٹوٹے اکویریم کی جو کرچیں تھیں
پلکوں سے چنتا رہا

قالوآن (۲)

ایک بدوی نے اٹھایا تھا سوال
 آپ کے تن پر امیر المومنین
 چادریں دو دو کھال سے آگئیں
 تب دیا تھا اس کو بیٹے جواب
 اپنے حصے کی انھیں میں نے ہی دی

دوسرا منظر

اے مرے خیا ط میرے دوست سن
 کاٹ لوں گا میں یونہی اس سال بھی
 میرے بچوں کو نیا ملبوس سی

احیاء

تو نثارِ بول سے گزرتے ہوئے پیٹھ پر نے
 اُن نثارِ بول کے مکینوں کا جب احیاء چاہا
 خوابِ مرگ آسا ملا
 آنکھ کھولی تو یہ دیکھا
 خمرِ خوابیدہ تھا ریزہ ریزہ
 مگر دم و تازہ تھا مگر زادِ سفر
 اور پھر شہر میں سکون کا چلن بھی بدلا

میں پیمر نہ سہی
 دیدہ بے خواب کے ساتھ
 رات دن ایسے نثارِ بول سے گزرتا ہوں
 جہاں لکڑیاں عیش کیا کرتی ہیں
 بھوکے بچوں کو جہاں نمٹائیں
 دودھ کیا دیتیں فقط کوس لیا کرتی ہیں
 شہر میں کام نہیں کھوٹے سکے

میں پیمر نہ سہی تو تو خدا ہے اب بھی
 اُن نثارِ بول کے مکینوں کا بھی احیاء ہو جائے

ایک پریم ستلے

چلو اک ذرا جائزہ لے کے دیکھیں
 ستارے کہاں سانس لینے رکے ہیں
 کہاں سانپ ہیں فاختائیں کہاں ہیں
 کہاں ہیں وہ معصوم ہرنوں کی ڈارتی
 کہاں بھیر پڑے ان کے چھپے پڑے ہیں
 کہاں پھلیاں بن رہی ہیں غذا پھلیوں کی
 کہاں کھڑیاں جال بننے لگی ہیں
 کہاں مرغیاں اپنے چوزے پروں میں چھپا کر
 گدھوں کے مقابل ٹوٹی ہیں
 یہ وہ سرزمین ہے جہاں سانپ بھی
 توڑ کر پی رہے ہیں پرندوں کے انڈے

کہاں یا برہنہ چلے جا رہے ہیں
 ڈھلانون سے اٹھ کر پہاڑوں کی جانب
 جمی برف میں تخم بارود بونے
 کہاں آگ پھیلی ہوئی ہے
 کہاں گھر کے گھر جل رہے ہیں
 کہاں حسن کی دیویاں جل رہی ہیں

یہ باپو کی نہرو کی آزاد کی سرزمین
 یہ اہینا کی واوی
 یہ تہذیب کا اک نشان
 علم کا خطہ بے کراں
 مجھے لگ رہا ہے کہ یہ تو لباسوں کا اک شہر ہے
 ان لباسوں کے نیچے فقط زہری زہری ہے
 لذتِ حرف سے نابلد
 دیکھ کر جن کو حیراں خرد
 اُگلتے ہوئے اپنی کالی زبانوں سے کالے حروف
 یہ خالی ظروف

ہے شہروں میں جنگل کا قانون نافذ
 ہے جنگل بھی مکار شہری سے عاجز
 یہاں اپنے ہی بھائی بندوں کے سینے ہیں چھلنی
 مجھے صورتِ حال ہے یہ بدلتی
 میں جھنڈا اٹھاتے ہوئے امن کا چل رہا ہوں

چرندوں پرندوں درندوں
 سمجھوں سے گزارش ہے میری
 مرا ساتھ دیں
 ایک پرچم تلے چین کا سانس لیں

چہار جانب ابھی عناصر کی حکمرانی ہے
 کون سنتا میری کہانی
 میں اپنی آواز کھورہا ہوں
 دواغ اب تم سے ہو رہا ہوں
 مگر یہ سن لو —

زبان اک گنگ ہو گئی ہو تو یہ نہ سوچو
 کہ اب نہ ٹوکے گا کوئی تم کو
 اگر کوئی آنکھ بچھ گئی ہو تو یہ نہ سمجھو
 کہ اب نہ دیکھے گا کوئی تم کو
 اگر کوئی ہاتھ کٹ گیا ہو تو یہ بھی دیکھو
 ہزار ہاتھوں کا ایک جنگل اگا ہوا ہے
 ہے پاؤں کوئی جو چھالا چھالا تو یہ تو جانو
 کبھی کوئی راہ بے قدم بھی کہیں ہوئی ہے
 وہی جیالوں کی بھیڑ سی اک لگی ہوئی ہے

میں اپنی آواز کھورہا ہوں

میں اپنی آواز کھورہا ہوں
 یہ کن مناظر کا بوجھ آنکھوں پہ ڈھورہا ہوں
 یہ کیسی جینیں سماعتوں میں سمورہا ہوں

فضا دکن میں جو معتدل تھی وہ مشتعل ہے
 عجیب آندھی ہے برگِ نو خیز ہو کہ برگد
 ہے اس کی زد میں
 نہیں ہے کوئی بھی اپنی حد میں
 بہا چلا جا رہا ہے ہر خواب رد و کد میں

شمال شعلوں میں گھر گیا ہے
 کہ ایک چنگاری برف زاروں میں بھی ہے زندہ
 جو اپنی خاکستر بدن سے اٹھی تو کشتوں کے سر چڑھی ہے
 چھڑے ہیں دیر و حرم کے قصے
 نہ دیر سے دیریوں کو اگلا سا پیار
 اہل حرم بھی اب بے حرم بہت ہیں
 وہی انا کے شکار
 بے اختیار دونوں

شکار مشرق میں نہر آشوب چشم کا ہے
 تمام دن سر پہ خاک ٹوالے
 وہ سبز منظر بھی لال آنکھوں سے دیکھتا ہے
 سفید گھوڑے ہیں کالے بھوتوں کی دسترس میں
 سفید پوشوں کے ہیں گریبان چاک
 سر پہ ہے خاک

بدن میں مغرب کے جو سراپت ہے زہر بے نام زخم کا ہے
 وہ زخم جس کو سمندری پانیوں سے دھونے کی کوششیں ہو رہی ہیں دن رات
 زہر وہ جو رگوں میں پیڑول بن کے گردش کرے
 دھماکے کا منتظر ہے

سمندری فیل اک اشارے کے منتظر ہیں کہ روند ڈالیں
 ادھر سنبھالے ہوئے ابابیل

اپنی چونچوں میں تشنہ و تاب کارکنگر
 بساط مشکل ہوئی ہے اک مہرہ غلط سے
 ہیں ایک گھوڑے کی زد میں شاہ و وزیر دونوں
 غروب جس سرزمین میں سورج نہ ہو سکا تھا وہ دم بخود ہے
 انہی کو انعام و خلعت قاخرہ ملی ہے
 جو بیہریت کی ایک کنگی مثال ٹھیرے

چھاؤں

والدہ مرحومہ کے نام

وفات ۲۳ ستمبر ۱۹۸۹ء

کسی نے شاخ لگالی ہے اپنے آنگن میں
کسی نے پھول چتے ہیں کسی نے پھل چکھے
کسی نے چھال سے تیری بنا لیا صندل
کسی کسی نے تویتوں سے گھر سجا ڈالا

تجھے خبر تھی کہ میں ایسا اک مسافر تھا
گھنی گھنی تری چھاؤں میں بیٹھ جاتا تھا
کہ تیری چھاؤں ہی زاد سفر تھی میرے لئے

کھڑی ہے دھوپ بھی لمبا ابھی سفری نہیں
کہاں رکوں مرے رستے میں اب شجری نہیں

پردازِ مشقتِ خاک

کہا گیا تھا کہ تیرے میں پھول پھل سارے
تمام شہد کے دریا یہ دودھ کی نہریں
کہا یہ میں نے کہ میں کیا کروں یہ نظارے
مزدہ تو جب ہے کوئی خوش بدن ہو پہلو میں

تویوں ہوا کہ بدن کی رفاقتیں بھی میں
بدن کے نشے کے آگے کوئی نشہ نہ ٹکا
تمام ذائقے چھوٹے پڑے سبک ٹھیرے

پھر اس کے بعد بہانہ تھا مینوہ ممنوع
عطاسے خاص کی صورت مجھے ملا کیا کیا
کہا۔ سنبھال کہ یہ کائنات ہے تیری
یہ جزر و مد یہ سمندر یہ شاخ تریہ بول
یہ من و سلویٰ کی بارش یہ باندہ کا نزول
تمام ذائقے چھوٹے پڑے سبک ٹھیرے
تو پھر یہ پیاز یہ لہسن یہ ترہلکے یہ تھکسن

کہا یہ میں نے ادب سے کہ اے مرے مالک
 یہ کائنات کہاں میں سنبھال کر رکھوں
 نظر وسیع مگر جذبہ قناعت دے
 وہ یار خوش بدن و گوشہ فراغت دے

کہا یہ اس نے کہ تیری دعا قبول، مگر
 وہ اک جنوں کہ جسے کائنات چھوٹی پڑے
 طلال یہ ہے کہ دیوار و در میں قید ہوا !

تو یوں ہوا کہ زمین و زماں سنبھال لیا
 مکاں سنبھال لیا لامکاں سنبھال لیا

بونوں کا خواب

ساحلی علاقوں پر رہنے والے بونوں نے
 ریت کے گھر وندوں سے سر نکال کر دیکھا
 لمبے چوڑے شہروں کے اونچے اونچے محلوں میں
 خوش اداقد اور بعض لوگ رہتے ہیں
 سارے لوگ عزت سے جن کا نام لیتے ہیں
 ساحلی علاقوں پر رہنے والے بونوں کے چہرے تھما اٹھے
 جیسے ان کے سینوں میں کوئی پھانس چھپتی ہو

ایک روت بونوں نے جمع اک جگہ ہو کر
 فیصلہ یہ فرمایا
 ایک ایک قد آور قتل کر دیا جائے

خوش اداقد اور قتل ہو گئے لیکن
 سکر اتے بونوں کا قد تو پھر بھی چھوٹا ہے

یارِ انِ بے وسیلہ

یہ غار، غارِ حرا نہیں ہے
چلے تھے پکنک منانے لے کر شراب کی بوتلیں
اچانک
چٹان نے ڈھک لیا ہے رستہ
کوئی بھی راہ مفر نہیں ہے

آتورانی ہے
ب نے مزدوریاں ہڑپ کی ہیں
ج قاتل ہے اپنے والد کا

کسی کے فردِ غل میں ایسا نہیں ہے کچھ بھی
جسے وسیلہ کریں، دعائے نجات مانگیں
کسے وسیلہ بنا کے راہِ نجات ڈھونڈیں؟

بے اثاثہ

(والد مرحوم کی نذر)

یہ واقعہ ہے کہ میں ابنِ بے اثاثہ ہوں
 نہ کوئی گھسرنہ زمیں پائی میں نے ترکے میں
 وہ ایک گھر جو تھا پیر کھوں کا آخری پندار
 ہوا ہے اس پہ بھی اتمامِ لطفِ آخرِ کار

مری شریکِ نفس ہے تمہاری باپتی سانس
 لہو تمہارا مرے جسم و جاں میں شامل ہے
 تمہارا ریشہ گناہوں سے روکتا ہے مجھے

یہ ہاتھ خالی نہیں صاحبِ قلم ہوں میں
 یہ آنکھ کا سہ نہیں چشمِ معتبر ہوں میں
 یہ دل سیاہ نہیں نور کا سند رہے

مجھے تمہارے وسیلے سے مل گیا کیا کیا
 یہ جھوٹ لگتا ہے میں ابنِ بے اثاثہ ہوں

پناہ

بے تحاشہ دوڑتا ہے

اک سرا سیمہ ہرن
اڑ رہا ہے دوستک اسکی چھلانگوں سے غبار
اک شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہے دیر سے

خوف کا مارا

پریشاں

تھکھڑا ہرن

ایک بھوکے شیر کے مسکن میں لیتا ہے پناہ

ہم اپنی رائے کیا ضائع کریں پھر؟

ہم اپنی رائے کیا ضائع کریں پھر
اُسے خود بھی خبر ہے جو ترزدلے کے بیٹھ ہے
کہ ہے پاسنگ اس میں
شیر مگر کس کا ہے
باتھی بُد کا ہے
اور کیا سیکل کسی دن واقعی
ایک طیارے سے ٹکرا جائے گی؟
اور کیا یہ وہی کشتی نہیں ہے
خضر نے جس میں کیا دریا توپا ر
اور پھر سوراخ کمر کے رکھ دیا
اور کیا یہ وہی اتنا نہیں
جورات بھر سورج کی پوجا کر رہا تھا
اور دن کو ایک چمکا ڈر کی صورت
صبح سے لٹکا ہوا ہے
یہ کنول جو گود میں کیچڑ کی ہے
اور کیچڑ ہی مقدر اس کا ہے

اور کیا۔ یہ وہی سیڑھی نہیں ہے جس پہ چڑھ کے
اپنے ہمسائے کے گھر میں جھانکتے ہیں
یہ وہ ممنوعہ شجر ہے جس کا ہر پھل ہے لذیذ
اور پتے بے ٹھکانہ پھر رہے ہیں

یہ وہی تو ادنٹ ہے
(تخلیق پر جس کی خدا نے نخر فرمایا،
کو جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے

آنکھ والوں کے لئے یہ اور ایسی ہی کئی آیات ہیں
یہ سب اپنی جگہ فرعون ہیں۔ خوش ہیں
یہ ہم پر رائے اپنی ٹھونسے ہیں
ہماری رائے کے محتاج بھی ہیں!

ہم اپنی رائے کیا ضائع کریں پھر؟

آنخل

اُلٹ رہا تھا پرانی کتاب کے اوراق
مے ایک مٹوئے رنگین مجھے نظر آیا
بہت ہی غور سے میں دیکھتا رہا جس کو
بڑا حسین تخیل تھا اک مصوّر کا

میں محو حسن تھا اور انگلیاں چٹختی تھیں
خطوط جسم کہ طالب تھے گدگد ابرو کے
نظر کہ مانگ رہی تھی نشانہ بائے نظر
لبوں کے جام بھی پیاسے لبوں کے طالب تھے

یہ شاہکار تو تھا لیکن اس کا ایک پہلو
مے مذاقِ نظر کیسی قدر تھا گمراہ
مجھے لگا کہ ہے محتاج ایک آنخل کا
کلاہی جسم کا مفرد سینہ عریاں

مرا خیال صبا نے بھی جیسے بھانپ لیا
اُلٹ گیا اُسی لمحہ کتاب کا صفحہ

مرد ناداں

مجھے تسلیم۔ ہیرے کے جگر سے نابلد ہوں
مگر یہ بھی تو دیکھو
تمہارے ہاتھ میں بھی پھول کی پتی نہیں ہے

قابیل

اٹھا کے دیکھتے شاہد ہے آج تک تاریخ
کہ زندگی کا کوئی مرحلہ ہو
بھائی کو شکست بھائی کے ہاتھوں ہوئی ہے
کہ اتنی دیدہ دلیری
پراسے خوں میں کہاں!

ماں / باپ کی قبر پر

تمہاری قبر کہاں ہے مجھے نہیں معلوم
 مگر گمان ہی ہے یہیں کہیں ہوگی
 ہوا ہے شہر خموشاں بھی کس قدر آباد
 کچھ اور ہی تھا یہ ماقبل کچھ ہوا اب بعد
 تمہاری قبر پر کتبہ نہیں نشان نہیں
 کہ اس جگہ کی نشانی ہی بے نشانی ہے

یہ وہ مکان ہے جس میں مکس نہیں رہتا
 کہ آسمان کبھی زیرِ زمیں نہیں رہتا

تمہاری قبر پر کتبہ نہیں تو کیا غم ہے
 تمہارا نام رواں ہے مگر گِلیے میں
 تمہارا نام تو زندہ مری زبان پہ ہے

کھڑا ہوں ہاتھ اٹھائے میں آسمان کی طرف
 پکڑ رہے ہیں ادھر تکیاں مرے بچے
 چمک رہے ہیں ادھر میری آنکھیں جگنو
 (اداس ہو گئے تھے مری اداسی سے)

تمہیں خبر ہو دیے سے دیا جلے گا ہی
 ہمارے بعد بھی یہ سلسلہ چلے گا ہی

چراغِ محسّم

آیا کہاں سے لکھنؤ ایک ابرِ خوش خرام
 چپکے سے دھول جھونک کے موسم کی آنکھ میں
 دریا کے ہونٹ مل گئے صحرا کے ہونٹ سے
 ہریالیاں ہیں آہوئے خوشِ رم کی آنکھ میں
 بے کوئی میگو دوت کا پیغام جاں فزا
 یا حرفِ انفعال ہے آدم کی آنکھ میں
 صحرائے تشنہ لب پہ جو پانی کی بوند ہے
 الماسِ بے بہا ہے وہ عالم کی آنکھ میں
 نکتہ نواز ہے وہ سیاہی کی ایک بوند
 یا کوئی تل ہے لوحِ مکرم کی آنکھ میں
 گردابِ ناچتے ہیں سمندر میں، یا شلوک
 ہیں بے بساط آیتِ محکم کی آنکھ میں
 بے معنی تو نہیں ہیں حروفِ مقطعات
 ہاں کچھ تو ہے کتابِ مسلم کی آنکھ میں
 یہ حرفِ نازِ قم، سخنِ ناگزیر ہے
 وہ پڑھ، لکھا ہوا ہے جو موسم کی آنکھ میں
 رونقِ حریم کی ہے تو نا محرموں سے ہے
 ڈورے ہیں یا کپاس کے ریشم کی آنکھ میں
 سورج کی آنکھ میں تو سحر کا جلال ہے
 راتوں کا سب جمال ہے شبِ نیم کی آنکھ میں

دھبہ ہے اختیار شبِ روسیاء پر
 جو نوند ہے چہرہ غمِ محترم کی آنکھ میں
 دیتا ہے کوئی زخم تو کھاتا ہے کوئی زخم
 ایک ایک جاں نثار ہے پرچم کی آنکھ میں
 لاکھ صلی کے کرب سے اٹھتا ہے اک دھواں
 آنسو نہیں ہیں خوگر ماتم کسے آنکھ میں
 چھتر کے پر سے بڑھ کے نہیں ہے یہ کتر و فر
 ٹھیرا ہے جو متاع کے دھم کی آنکھ میں
 انسان خیر جان سہی کائنات کی
 اک ریزہ خرف ہے چم و خم کی آنکھ میں
 مومن دکھائی دے نہ مہمین دکھائی دے
 لگتا ہے بال پڑ گیا عالم کی آنکھ میں
 آتش پرست آگ لگاتے ہیں برف میں
 جنت کھٹک رہی ہے جہنم کی آنکھ میں
 آنکھوں کو انقلاب کا چسکا ہے کیا کریں
 سب ڈھیر ہے اصولِ مرثم کی آنکھ میں
 نگہ میں چھپا ہوا کوئی سہرا ب ہونہ ہو
 آنکھیں ملا کے دیکھ تو رستم کی آنکھ میں
 سر ہے تو سراٹھا کے سدا سرکشوں سے مل
 سپنا کوئی نہ پال سرِ خم کی آنکھ میں
 قائم ہے خیر صرف یک مارنے تلک
 جو فاصلہ ہے عزمِ مصمم کی آنکھ میں

تم کہاں کھو گئے

تم کہاں کھو گئے ہو
مجھے لگ رہا ہے
مرے ٹائپ رائٹر کا اک حرف اے (A)
ٹوٹ کر گر گیا ہے
کہیں کھو گیا ہے
تمہیں کچھ خبر ہے کہ اب میری تحریر
بے ربط سی ہو گئی ہے
تم کہاں کھو گئے ہو

خصی شدہ شیر

اے خصی شدہ شیروں کے خصی شدہ بیٹو
شیرنی تو کیا تم تو لومڑی سے بھی جفتی کر نہ پاؤ گے
شاید آج تک اسی دھوکے میں ہو تم
کہ جنگل کے بادشاہ ہو۔ لیکن
تم تو زوڑ میں ہو پیارے

گیت

دور نہ جانا ان آنکھیوں سے میرے من کے میت
ٹوٹ نہ جائیں سارے سینے روٹھ نہ جائیں گیت

تیرے بنا ہر شام اکیلی رات ادھوری ہے
جیون کے ہر گپ پر تیرا ساتھ ضروری ہے
ساتھ بھاتا ہر رت میں ٹھیری ہے پیار کی ریت
دور نہ جانا ان آنکھیوں سے

تو ہے تو پھولوں میں خوشبو کلیوں پر ہے روپ
تو ہے تو لگنے لگتی ہے مٹھی مٹھی دھو سپ
تو ہے تو ہر مات بھی اپنی لاگے اپنی جیت
دور نہ جاتا ...

تو میری پہچان ہے ساجن میں تیری پہچان
ہم دونوں اک جان ہیں ساجن تو اتنا تو جان
پریت میں کیسی دوری ساجن دوری میں کیا پریت

دور نہ جانا ان آنکھیوں سے ..

یک مصرعی نظمیں

* بہتات

خوشبو کے اضافے سے بھی دم گھٹتا ہے

* ن۔م۔راشد

البتہ تم شاعر ہو جاتے لیکن ...

* سمجھوتہ

شاید تم ہی سچ کہتے ہو

* قصاص

قصاص لینے کی تم میں ہمت اگر نہیں ہے تو خوں بہا بھی نہ لے سکو گے

* بیوہ

وہ جو اک بابل کی بیوہ تھی اس کا کیا بنا

مضمون ادب مصرع برجستہ تمام کی ہے
منت پذیر مصرع دیگر نمی شود اقبال
”خود اس شعر میں پہلا مصرعہ کافی ہے“
_____ خیر _____

* بالآخر

ثابت ہوا کہ یہ بھی آنا کا مریض ہے

* اطمینان

ثابت ہوا کہ اپنے خدو خال ٹھیک ہیں

* ۵۹

تیری وفا اپنی جگہ دہ بے وفا اپنی جگہ

* عشق

خفا تو ہوتا ہوں، تم سے خفا نہیں ہوتا

* سلسلہ روز و شب

یہ روز و شب، کوئی بچہ پھراتے جیسے گلوب

* بھائی

وہ میرا بھائی ہے، کیا میں بھی اس کا بھائی ہوں؟

* صلہ

ہنزدروں کے انگوٹھے تراش دیتے ہیں

* ہمسفر

مڑہ سفر کا تو بس ہمسفر سے آتا ہے

* عزت نفس

گزر بھی ہنس کر جو ہوں مبارز طلب آیا، سچ

* زاویہ نظر

اپنی بیوی کو پرانی آنکھ سے بھی دیکھئے

* توانائیاں

کہاں کہاں نہ توانائیاں تمام ہوتیں

* کابوس

رات وہ خواب نظر آیا گلا سوکھ گیا

* اندیشہ ہائے دور دراز

اب کی برسات میں گیلی ہوئی دیوار بہت

* جائے شکر

پانی کیا اب سہی، شکر ہے کڑوا تو نہیں

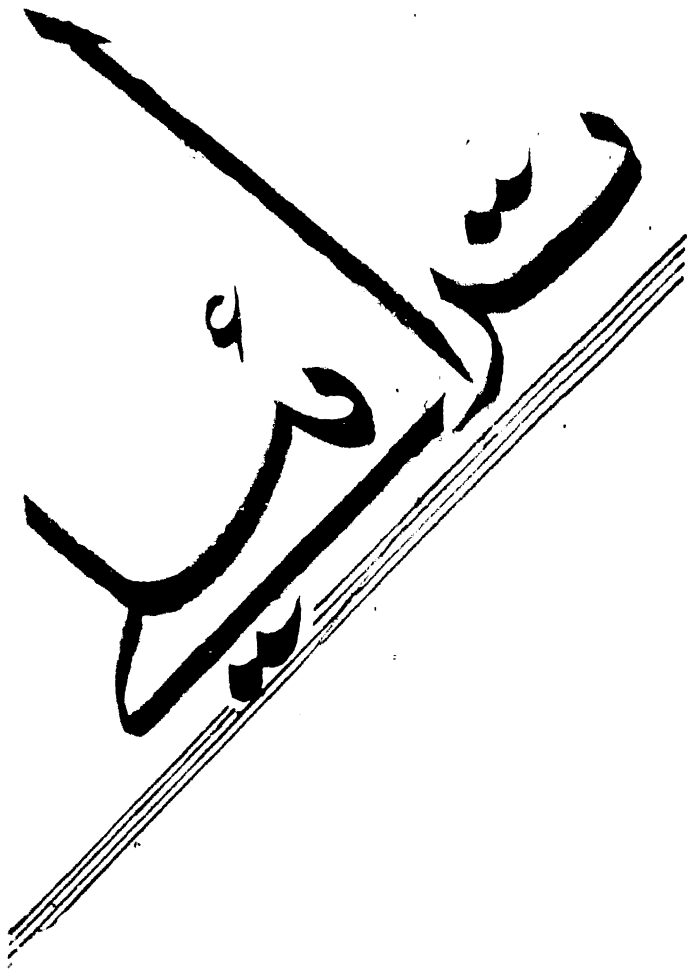
* سفارش

ہر سند سے بڑی سفارش ہے

* تعلق خاطر

میں جانتا ہوں یہ رشتہ اٹوٹ ہوتا ہے

* کسر
اک آنچ کی کسر بھی اگر ہو تو ہے بڑی



کچھ جہدِ زندگی کی نشانی بھی ہم میں تھی
دنیا سراپ تھی تو روانی بھی ہم میں تھی

رہے جو گم شدگی ہم سفر تو اتنی ہو
گزر رہے ہو کہاں سے خبر تو اتنی ہو

✱

ہم جو گھر جاتے ہیں چلتے نہیں پیتے گھر پر
کھیلے کودتے بچوں کی ہنسی پیتے ہیں

✱

ٹھن گئی ہے یہ کیسی اوس اور خزر ج میں
پھر زمین حائل ہے چاند اور سوج میں

✱

دنیا سے سداٹھا کے ملو گکارؤں خیر
ہاں آئینے کے سامنے گردن خمیدہ ہوں

✱

میرے شریک مجرم مرے یار تم بھی تھے
میں پارسانہ تھا تو گستاخ تم بھی تھے

تم سے تو خیر کوئی شکایت نہیں مگر
میں خوش گماں تھا اور ملنسار تم بھی تھے

ہائی جیک

یہ کس بدن میں اتا را گیا مجھے لا کے
 یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریفِ نا محسوس
 بنے تھے کیا کیا نہ میں نہ حیات کے خاکے
 یہ کس بدن میں اتا را گیا مجھے لا کے
 یہ کون ہے جو مجھے یہ غماں بھرا کے
 ہوا ہے میری طرح اپنے آپ سے مایوس
 یہ کس بدن میں اتا را گیا مجھے لا کے
 یہ کون مجھ میں چھپا تھا حریفِ نا محسوس

cul de sac

میں عمر و عشق کی اس رگدڑ میں ایک ہی ہوں
 یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود
 میں باجیت کا فائل ہوں صلح کیسے کمروں
 میں عمر و عشق کی اس رگدڑ میں ایک ہی ہوں
 جہاں سے ٹوٹنا چاہوں تو لوٹ بھی نہ سکوں
 نفس کی ڈور سے سلگی ہوئی بدن بارود
 میں عمر و عشق کی اس رگدڑ میں ایک ہی ہوں
 یہ جانتے ہوئے آگے ہے راستہ مسدود

کارِ جہاں دراز ہے

آدمی بر سرِ بغاوت ہے
 قعرِ ازل سے قعرِ احسن تک
 قاصدہ یوں تو بے نہایت ہے
 آدمی بر سرِ بغاوت ہے
 سر سے پاتک جوازِ محنت ہے
 من و سلوی سے پیازِ لہسن تک
 آدمی بر سرِ بغاوت ہے
 قعرِ ازل سے قعرِ احسن تک

طاہم کیپسول

بنو امیہ ہی باقی نہ ہے بنو عباس
 نہ اپنے آپ کو دہر کے تھک سکی تاریخ
 ہوا و حرص بھلا کس آسکے ہیں راس
 بنو امیہ ہی باقی نہ ہے بنو عباس
 سروں میں دفن ہوئی اقتدار کی بویاس
 ہر ایک حرفِ ہوس پر کھنچا خطِ تنسیخ
 بنو امیہ ہی باقی نہ ہے بنو عباس
 نہ اپنے آپ کو دہر کے تھک سکی تاریخ

دیوار

(اپنے اکلوتے بھائی کے نام،)

ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو جھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح
اتنا بودا تو نہ تھا خون کا رشتہ اپنا
اپنی اپنی بے خوشی درد ہے اپنا اپنا
ہم موئے شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح
ایک ہی چھت کے تلے رہنا جو جھوٹا اپنا
ایک ہی شہر میں رہتے ہیں نہ رہنے کی طرح

نومنس لینڈ

NO MAN'S LAND

یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے
یہ ہمارے ہاتھ کا لکھا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس کا ہونا چہرہ ہی کیا ہونا نہیں ہے
اس کی ماں بے شک گھٹیتا نہیں ہے
یہ تمہاری کوکھ سے جنما نہیں ہے
اس سے اپنا کیا کوئی رشتہ نہیں ہے

رنگ ماسٹر

”نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن“
 کہ ہم تو سرکس کے جاسٹو ہیں
 اشیاء تازیانہ سے بہت
 نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
 یہ سب ریا کاریوں کا مامن
 یہ ہم اداکار بے نگر ہیں
 نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن
 کہ ہم تو سرکس کے جاسٹو ہیں

لمبو

میں جہاں ہوں وہاں دفن خریج بھی ہیں
 ایک آواز حق بھی، سمیٹہ بھی ہے
 گھر کے آنکھ ابو جہل کے کچ بھی ہیں
 میں جہاں ہوں وہاں دفن خریج بھی ہیں
 چور زانی شرابی ہیں اور زنج بھی ہیں
 میں ہوں سب الگ سب رشتہ بھی ہے
 میں جہاں ہوں وہاں دفن خریج بھی ہیں
 ایک آواز حق بھی، سمیٹہ بھی ہے

یدِ بیضا

وہ ایک جگنو جیسے ہم نے کچھ نہ سمجھا تھا
 اسی کے دم سے تھے ہم صاحبِ یدِ بیضا
 اندھیری رات میں اک آسرا تو گویا تھا
 وہ ایک جگنو جیسے ہم نے کچھ نہ سمجھا تھا
 ہمارا کچھ بھی نہیں تھا سب اس کا اپنا تھا
 ہمارے ہاتھ میں آکر ~~کل~~ گیا کیسا
 وہ ایک جگنو جیسے ہم نے کچھ نہ سمجھا تھا
 اسی کے دم سے تھے ہم صاحبِ یدِ بیضا

سم سم

اپنا وہ حال تھا اندر بدل گیا
 وہ حرفِ مختصر وہ حرفِ راہِ در
 بہرہِ بساطِ بھرپا کر بدل گیا
 اپنا وہ حال تھا اندر بدل گیا
 لمحہ گزر گیا منظر بدل گیا
 اندھے تھے جیسے ہم سم سم کو بھول کر
 اپنا وہ حال تھا اندر بدل گیا
 وہ حرفِ مختصر وہ حرفِ راہِ در

25th مرحلہ

کس ساعتِ شدید کے زرخے میں آگئے
 ہر چیزِ دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے
 جنگل کے جتنے شیر تھے پھرے میں آگئے
 کس ساعتِ شدید کے زرخے میں آگئے
 یہ کس ڈگر پہ جاگتے سوتے ہیں آگئے
 جو شکلِ حریرِ جاں تھی دی اب جتنی سی ہے
 کس ساعتِ شدید کے زرخے میں آگئے
 ہر چیزِ دائرے سے نکلتی ہوئی سی ہے

بے مکانی

اس خاک سے ہزارِ یونہی جی لگائیے
 بے آسمان کر کے رہے گی زمین تو
 ہر چند سو طرح کا تعلق نبھائے
 اس خاک سے ہزارِ یونہی جی لگائیے
 مٹی سے ہاتھ، ہاتھ سے مٹی چھڑائیے
 ہے بے مکانیوں سے ہی شانِ کمین تو
 اس خاک سے ہزارِ یونہی جی لگائیے
 بے آسمان کر کے رہے گی زمین تو

نذر غالب

محرف ہو چکیں تورات کی سب آیتیں بھائی
نئے پیغمبروں پر اب نئے سورے اترتے ہیں
جو اپنے دور کے معیار پر پورے اترتے ہیں
نئے معنی دکھاتی ہے نئے لفظوں کی رعنائی

نئی دھوپوں میں پھلی رات کے خواب نہ روتے
مسائل نور کی ہر بوند پی لینے کے عادی ہیں
ادھر ہم بھی نئے سورج اگا دینے کے عادی ہیں
کہ ہم ڈرتے ہیں اپنے قد سے بڑھ جائیں یہ سائے

غلط ہے یہ کہ ہم ماضی کی تصویریں سچڑتے ہیں
مگر یہ سچ ہے اپنا درد اپنا درد ہوتا ہے
ترے لمحے میں اپنا غم سمونا ایک دھوکا ہے
نئے لوح و قلم سچیدہ تحریریں سچڑتے ہیں

تو اپنے دور کی آواز تھا یہ مانتے ہیں ہم
مگر جو غم ہے اپنے دور کا پہچانتے ہیں ہم

تذکرہِ ملٹن

بڑے مزے میں تھا تینس سال تک ملٹن
 غمِ حیات سے جب اسکو ہماری بھی نہ تھی
 مزے کی بات تو یہ ہے خود آگہی بھی نہ تھی
 ادا ادا سے نمایاں تھا اس کا بھولا پن

ہوئی نہ تھی ابھی حالات سے شناسائی
 نہ گھر کی فکر نہ باہر سے خوف آتا تھا
 بڑے سکون سے ہر روز بیت جاتا تھا
 ملا نہ تھا ابھی اس کو شعورِ تنہائی

یہاں یہ حال کہ تینس سال کا عرصہ
 پلک جھپکتے تو کیا بیتا کہ راموں میں
 ہزار موڑ تھے خوں مانگتی پناہوں میں
 کٹا ہے جاگتے خواب و خیال کا عرصہ

اُسے ملال رہا دورِ لاشعوری کا
 یہاں ملال ہمیں اپنی باشعوری کا